خالی ہاتھ

www.taemeernews.com

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

عاتق شاہ

خلیج

رپورتاژ

ٹائیٹل .. .. سعادت علی خاں

خوشنویسی .. .. محمد غالب

طباعت .. .. نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

بلاک .. .. ڈان کمپنی

تعداد .. ۱۰۰۰

مئی ۱۹۷۲ء

قیمت تین روپے پچاس پیسے، Rs.3/50

ملنے کے پتے:

- ادبی ٹرسٹ کنارا بنک عابد روڈ حیدرآباد
- حیدر اینڈ سنس مچھلی کمان حیدرآباد
- نیشنل بک ڈپو چارمینار حیدرآباد

ناشر: حمیرہ پبلیکیشنز 16-3-587 چنچل گوڑہ حیدرآباد ۲۴

www.taemeernews.com

اردو زبان کو خون دینے والے شہدا

جٹے - بہادر سنگھ

اور

پنڈت دیو نرائن پانڈے

کے نام ——

www.taemeernews.com

مصنف کی مطبوعہ کتابیں

- فٹ پاتھ کی شہزادی
- ایک وقت کا کھانا
- اندھیری
- مائی ڈیر شگفتلا
- عابد روڈ سے کرشین اسٹریٹ تک
- چالیس قدم
- ہم جنم جنم کے ساتھی

●

زیر طبع : راجندر سنگھ بیدی
شخصیت اور فن
(تنقید)

www.taemeernews.com

خالی ہاتھ

میں ابھی ابھی بمبئی سے آیا۔ اور آتے ہوئے راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ میں خالی ہاتھ اپنے گھر جا رہا ہوں۔ ظاہر ہے اس خیال میں بڑی چبھن تھی۔ اور اس چبھن کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کچھ اور سوچ نہ سکا اور نہ راستے کی کوئی شئے مجھے اپنی طرف متوجہ کر سکی۔ ٹرین کے ہنگامے مسافروں کے نئے نئے چہرے۔ اور نظروں کے سامنے سے گذرتے ہوئے مناظر میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ آدمی کو اس قدر حساس ہونا چاہئے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بے حسی کا دوسرا نام موت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو شاید اتنا ہی متاثر ہوتے

www.taemeernews.com

جتنا کہ میں ہوا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کے تاثرات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھ سے زیادہ ہی متاثر ہوتے یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور جس طرح خوش خوش گئے تھے ویسے ہی خوش خوش لوٹ جاتے۔ بہرحال کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ آپ ہوتے تو کیا ہوتا۔ آپ کیا کرتے۔ اور کیا نہیں کرتے۔ اس وقت تو میں اپنے متعلق سے یہ سوچ رہا تھا کہ میں بڑا اداس تھا۔ اور رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ میں خالی ہاتھ لوٹ رہا ہوں!

ویسے میں خالی ہاتھ ہی گیا تھا حالانکہ لوگ جب ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے ہیں تو کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ ان کی جیبیں بھری ہوتی ہیں یا نہیں تو ساتھ بنک ڈرافٹ ہوتا ہے۔ پتہ نہیں نئے شہر اور نئے مقام پر کیا ضرورت پیش آئے۔ روپیہ اگر خدا نہیں تو خدا کا قائم مقام ضرور ہے۔ ہر مصیبت میں کام آتا ہے۔ ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ روپیہ اچھا لئے اور اپنی پسند کی ہر شئے خرید لیجئے۔ لیکن میرا معاملہ دوسرا تھا۔ میں بمبئی شاپنگ کی غرض سے نہیں گیا تھا اور نہ کسی بزنس کی خاطر۔ اور نہ میں ان سینکڑوں بدنصیبوں میں سے ایک تھا جو روٹی کی تلاش میں بمبئی کا رُخ کرتے ہیں۔ نہ فلم انڈسٹری کا گلیمر مجھے اپنی طرف کھینچا تھا اور نہ میں نئے شادی شادہ جوڑے کی طرح کچھ فرصت کے رات دن گذارنے گیا تھا۔ اور نہ کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوکر۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ بیوی بچوں اور دنیا سے بے زار ہوچکا تھا۔ لہٰذا خودکشی کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ یہاں کوئی اعتراض کرسکتا ہے کہ جب مرنا ہی ٹھیرا تو موت سے پہلے اس طویل سفر کی زحمت کیوں اٹھائی جائے۔ آدمی تو کہیں بھی

www.taemeernews.com

مرسکتا ہے۔ دیوار سے بھی ٹکرا سکتا ہے یا کسی بس یا ٹرین سے۔ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن شریف اور باعزت آدمی موت کے بعد بھی اس روایتی اور خاندانی شرافت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے جو اسے زندگی بھر عزیز رہی۔ اور وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی میت دوسروں کے لئے تماشا بن جائے۔ لیکن اجنبی شہر کی بات دوسری ہے۔ وہاں کون کسے پہچانتا ہے۔ اور کسے اتنی فرصت ہے کہ اپنا قیمتی وقت ضائع کرے۔ شاید اسی لئے مرنے اور مارنے والے بمبئی ہی کو منتخب کرتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو بمبئی ہے عجیب وغریب شہر۔ اسمگلر سے لے کر حاجی تک بمبئی کی شاہراہوں پر گھومتے نظر آئیں گے۔ یوں لگتا ہے جیسے بمبئی ایک ایسی خوبصورت جوان عورت ہے جو مسکرا مسکرا کر اشارے کرتی ہے اور دور دور سے لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ جیسے ہی یہ سب اس کے قریب پہنچتے ہیں بمبئی اپنا بن جاتی ہے۔ بمبئی کے اس عیارانہ رویّے سے کیا آپ واقف ہیں!

میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا ورنہ آپ سے کسی ایسی تفصیل کی خواہش کروں گا جو آپ کو کوئی کہانی سنانے پر مجبور کرے اور اس سے حاصل بھی کیا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ میں بمبئی گیا تھا۔ اور اب بھی اس بات کو میں دوسرے الفاظ میں یوں دہرانا چاہتا ہوں کہ میں بمبئی نہیں گیا تھا جی ہاں خود سے نہیں گیا تھا۔ بلکہ شہر بمبئی نے مجھے بلوایا تھا۔ آل انڈیا اردو کنونشن کے صدر کرشن چندر کا دعوت نامہ میرے ہاتھ میں تھا۔

اور اسے پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کانفرنس میں ضرور شرکت کرنی چاہیئے جو ڈسمبر ۱۹۶۹ء کے آخری ہفتہ میں منعقد ہو رہی

www.taemeernews.com

ہے۔ اور جس میں ملک کے تمام اہم ادیب اور شاعر شریک ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ اردو زبان کے تعلق سے کوئی واضح پالیسی مرتب کی جائے اور ان ناانصافیوں پر سرکار کو توجہ دلائی جائے جو پچھلے بائیس سال سے اردو کے ساتھ ہو رہی ہیں۔

اُردو کا مسئلہ ایک زبان کا مسئلہ ہے اور زبان کا مسئلہ کلچر اور تہذیب کا مسئلہ ہوتا ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا مسئلہ ہوتا ہے اور جب کوئی سیاست داں زبان کے مسئلے کو سیاسی، مذہبی اور فرقہ وارانہ رنگ دیتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ ہٹلریت کے اس دور کو واپس لانا چاہتا ہے جس میں انسان ذات پات، نسل رنگ، اور قومیت کے مختلف خانوں میں بٹ گیا تھا۔

میرے سامنے جب بھی کوئی کسی کتاب کی، شعر کی اور نغمہ کی بات کرتا ہے تو میرا ہاتھ خود بخود ریوالور کی طرف چلا جاتا ہے۔

مجھے یاد نہیں یہ فقرہ ہٹلر نے کہا تھا یا مسولینی نے یا کسی اور نے۔ لیکن یہ اُس ذہن کو پیش کرتا ہے جو سماج میں ڈکٹیٹر شپ کو جنم دینا چاہتا ہے اور جو کسی جمہوری قدر کا قائل نہیں ہوتا۔

ہٹلر ختم ہو گیا۔ مسولینی ختم ہو گیا۔ لیکن آج بھی اس کی معنوی اولاد دنیا کے مختلف حصوں میں ان ہی نظریوں اور اصولوں کی تشہیر کر رہی ہے۔ کیونکہ یہ جانتی ہے کہ اگر سماج میں نراج پیدا کرنا ہے اور ایک طبقے کو دوسرے سے الگ کرنا ہے تو دونوں کے درمیان نفرت

www.taemeernews.com

کی، تعصب کی، مذہب کی اور زبان کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دو یہی نہیں بلکہ اگر کسی طبقے کو ختم کرنا ہے تو اس سے اس کی زبان چھین لو۔ اس طبقے کی سیاسی، معاشی، تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی موت واقع ہوجائیگی۔ وہ زندہ رہ کر بھی مردوں کی طرح بے حس رہے گا۔ کیونکہ زبان نہ رہنے کی صورت میں وہ کچھ نہ بول سکے گا۔ اور نہ اس پاس کی آوازوں کو سمجھ سکے گا اس طرح وقت واحد میں وہ گونگا اور بہرہ ہوجائیگا۔ کیونکہ زبان جہاں بولنے والوں کو طاقت بخشتی ہے۔ وہاں کسی بات کو سننے اور سمجھنے کی توفیق عطا کرتی ہے۔ زبان ایک ہتھیار ہے جو انسان اپنے وجود اور اپنی انفرادیت کی سلامتی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ایک میڈیم ہے جس کے توسط سے دو انسان ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ ایک آواز ہے جو دوسرے انسان کو اپنی طرف بلاتی ہے۔ ایک ہاتھ ہے دوستی کا جو مصافحے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ ایک پل ہے جس پر چل کر دو قومیں اور دو ملک ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ ایک آنسو ہے جو آنکھوں میں چھلک کر دل کی کہانی سناتا ہے۔ اور ایک مسکراہٹ ہے جو روح کی ساری خوبصورتیوں کو پیش کرتی ہے۔

زبان کیا ہے؟

یہ کسی بچے سے پوچھئے جو تتلا تتلا کر بات کر رہا ہے اور جس کا ایک ایک لفظ ماں باپ کیلئے، ایک چھوٹے سے خاندان کے لئے، اور سماج کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ اگر سماج اس کی بات کو سمجھنے سے انکار کر دے تو بتائیے کہ بچے کا کیا حشر ہوگا؟

سچ پوچھئے تو زبان ایک ضرورت ہے۔ ایک ایسی ہی ضرورت

www.taemeernews.com

جیسے زندگی کے لیے ہوا، پانی، غذا اور حرارت کی ہوتی ہے۔ اس کا نعم زندگی سے فرار ہے۔ اور ان کا مطالبہ زندگی کا فطری مطالبہ ہے۔ بالکل اسی طرح زبان کا بھی یہی معاملہ ہے۔ لہٰذا زبان کو باقی رکھئے تاکہ اس کے بولنے والے سینکڑوں، لاکھوں اور کروڑوں انسان اپنی روح کی ساری خوبصورتیوں کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ اور پیار و دوستی کا وہ گیت آفاق کی حدوں کو چھو سکے جس کے گلے میں تعصب اور نفرت کا پھندا پڑ گیا ہے۔

میں نے سوچا کہ بائیس سال کے بعد سہی، بیس سال کے بعد سہی آخر وہ دن آیا جب اردو زبان کے مسائل کے تعلق سے سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہی کیا کم ہے۔ معاف کیجئے میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ اس میں طنز کی کیا بات ہے۔ ضرورت تو اسی وقت سے محسوس کی جا رہی ہے جب لسانی بنیادوں پر ملک کی تقسیم ہوئی۔ ہر شئے کے حصے بخرے ہوئے۔

یہ تمہاری ہے ——

یہ میری ہے ——

صاف صاف انداز میں دفتر کی کرسی سے لے کر ٹائپ رائٹر تک کی تقسیم عمل میں آئی۔ اگر موقع ملتا تو شاید اردو کی بھی تقسیم عمل میں آتی۔ لیکن زبان کو، کلچر کو اور تہذیب کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ شاید اس لئے بھی —— اسی لئے بھی!

www.taemeernews.com

اُس وقت تک اُردو ملک کی ایک اہم زبان تھی۔ بعد میں یہ ملک کے دستور میں شامل کی گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ جیسے جیسے حالات بدلتے گئے اردو ایک ناپسندیدہ شہری کی طرح رہنے لگی۔ یا یوں سمجھئے کہ اس سے ایک اجنبی کی طرح سلوک کیا جانے لگا۔ کبھی کبھی پبلک پلیٹ فارم سے ایسی آوازیں بھی۔ سنائی دینے لگیں کہ کیا اس ملک میں اردو نام کی بھی کوئی زبان ہے؟

اُس وقت اُردو کے عاشق مصلحتاً خاموش تھے!

پھر اسٹیٹ ری آرگنائزیشن ہوا۔ ہر زبان کو اس کا اپنا صوبہ ملا۔ لیکن اردو کو کچھ نہ ملا۔ حالانکہ اردو نے کسی ریاست کا خواب دیکھا تھا اور نہ اس نے کوئی ایسی بات سوچی تھی۔ اور نہ اس وقت وہ کسی صوبے کی اصطلاح میں سوچتی ہے۔ کیونکہ اردو محبت کی، پیار کی، خلوص کی، سچائی کی، تہذیب کی، اخلاق کی اور انسانی اعلیٰ قدروں کی زبان ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جو سلوک ہوا اس کا ٹیکس ان سینکڑوں ملازمین سرکار کو ادا کرنا پڑا جو تقسیم کے وقت دوسری ریاستوں کے حصے میں آئے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ ان کی مادری زبان اُردو تھی۔

شاید اسی لئے اردو بولنے والے سرکاری ملازمین کے چہروں پر ایک یاسیت تھی۔ اور حالات کو نہ سمجھنے کا ایک اعتراف۔ اور ساتھ ساتھ ایک سوال بھی۔۔۔

کیا ہم کو اپنی زبان کے ساتھ اپنے وطن میں رہنے کا کوئی حق نہیں؟

کیا جمہوری سماج میں کسی شہری کے پیدائشی مقام کو کوئی اہمیت

www.taemeernews.com

نہیں دی جاتی ؟

کیا جمہوریت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ شوہر کو بیوی سے اور بچوں کو باپ سے علیحدہ کر دیا جائے ؟

آخر ہمارا قصور ——— ہمارا قصور ——— ہم نے وہ کون سا جرم کیا ؟

آج بھی مجھے وہ چہرے یاد ہیں۔ اور ان کے سوکھے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر ابھرتے ہوئے وہ سوال جن کے جوابات دینے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ سوال انہوں نے اردو زبان میں کئے تھے۔ جنہیں کوئی سمجھ نہ سکا یا پھر انہوں نے کسی ایسی زبان میں پوچھا تھا جو کسی کی سمجھ میں نہ آسکی۔ حالانکہ ان سوالوں کو پوچھنے کے لئے انہوں نے دنیا کی کسی زبان کا سہارا نہ لیا۔ بلکہ ایک ایسی نامعلوم زبان کی تحریر اپنے چہروں پر لکھ کر لائے تھے جس سے ہر متنفس اپنی اپنی زبان میں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کا جواب کون دے !

ہر شخص کے ہونٹوں پر ان گنت سوالات تھے۔ اور آنکھوں میں ایک وحشت جیسے ابھی ابھی وہ کسی میت کو دفن کر کے آرہا ہو۔ اب بھی جب میں اس لمحے کا تصور کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہے۔ وہ لمحہ جس کی تیز رو میں سینکڑوں مشترکہ خاندان ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اور خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بے رحم ہوا کے جھونکوں میں اڑ کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ حالات کے اس موڑ پر وہ نامعلوم سینکڑوں چہرے وطن سے دور ملک کے کسی نہ کسی حصے میں اپنی بیوی بچوں سے علیحدہ تنہا زندگی گذار رہے ہیں۔ کیا کوئی زبان اپنے چاہنے

www.taemeernews.com

والوں سے ایسا خراج وصولی کرتی ہے!

میں سمجھتا ہوں ایسی مثال دنیا کی کوئی زبان پیش نہیں کر سکتی یہ صرف اردو زبان کا مقدر ہے اور اردو بولنے والوں کی تقدیر۔ اس سے ہٹ کر کچھ نہیں۔ اسے اردو زبان کا المیہ کہیے یا اس زبان کے بولنے والوں کا کچھ فرق نہیں پڑتا ــــ

مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس وقت بھی اردو کے چاہنے والے مصلحتاً خاموش تھے!

اس وقت ان میں سے اُردو کے کسی نیتا نے یہ نہیں کہا کہ نئے ہندوستان میں اردو کو بھی اس کا اپنا جائز مقام ملنا چاہیے۔ اردو نہ کوئی ریاست چاہتی ہے اور نہ گدی پر بیٹھنے کی آرزومند ہے۔ وہ صرف اتنا ہی چاہتی ہے کہ اسے صرف ایک باعزت اور باوقار زندگی گذارنے کا موقع دیا جائے۔ اور اس کے بولنے والوں کو دستور کے مطابق ممکنہ سہولتیں دی جائیں ــــ

یہ اُردو کا کردار نہیں بلکہ اردو بولنے والوں کا کردار ہے۔ شاید اسی لیے اردو بولنے والے شائستگی کی سطح سے کبھی نیچے نہ آئے۔ بلکہ اپنے مطالبات کو انہوں نے بڑے وقار کے ساتھ کاغذ پر لکھکر پیش کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ شائستگی اور مشترکہ تہذیب کی اس زبان کو نہ سمجھا گیا میرا خیال ہے کہ دنیا میں مروجہ زبانوں کے علاوہ ایک اور زبان ہوتی ہے جس کا کوئی رسم الخط نہیں ہوتا۔ اور یہ وہ زبان ہے جسے آدمی دوسرے آدمی کی آنکھوں میں پڑھ لیتا ہے۔ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بات کرتے ہوئے اور ساتھ ساتھ رہتے ہوئے۔ بنا، کچھ کہے ساری باتیں اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

www.taemeernews.com

اور دنیا کی اس عظیم زبان کا نام ہے محبت کی زبان۔ یقیناً ہم سب اس زبان کو سمجھتے ہیں۔ بولتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم کھلے دل، کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں کے ساتھ مسائل کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں!

ماضی کی ایک ایک بات میرے ذہن میں گھوم گئی!

لسانی بنیادوں پر تقسیم ہونے والے نئے ہندستان سے بہت پہلے کی بات ہے جب کہ اُردو بولنے والوں کے لئے یوپی ایک میدان ذرین گیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے بیس لاکھ سے زائد دستخطوں کے ساتھ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد مرحوم کی خدمت میں اردو کا مطالبہ پیش کیا تھا اور صدر جمہوریہ کی توجہ خاص طور پر دفعہ ۳۴۷ کی طرف مبذول کرائی گئی تھی۔ اس دفعہ کے واضح الفاظ یہ ہیں۔

"اگر راشٹرپتی کو یہ اطمینان ہوجائے کہ کسی ریاست کی آبادی کا کافی (قابل لحاظ) حصہ اپنے بولنے کی کسی زبان کے استعمال کو اس ریاست میں منوانا چاہتا ہے تو راشٹرپتی یہ حکم دے سکتے ہیں کہ وہ زبان بھی ریاست میں یا ریاست کے کسی حصے میں جس مطلب کے لئے راشٹرپتی طے کردیں سرکاری طور پر مان لی جائے گی!"

اس وفد کی قیادت ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے فرمائی تھی۔

لیکن ارباب اقتدار کی طرف سے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا اور اردو دنیا پھر مایوسی کا شکار ہوگئی:

www.taemeernews.com

۱۵

جیسے ہی ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم صدر جمہوریہ ہندوستان کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے اردو عوام کی امیدیں ایک چراغ کی طرح روشن ہو گئیں۔ شاید اب کچھ ہوگا۔ شاید اب اردو کو اُس کا کھویا ہوا مقام مل جائے گا۔

یہی امید تو اس وقت بھی عوام کے دلوں میں طلوع ہوتی ہوئی سحر کی طرح بیدار ہوئی تھی جب اُردو کے صاحب طرز ادیب مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم کی حیثیت میں ہندوستانی سیاست کے اسکرین پر نمودار ہوئے تھے۔ لیکن ——

لیکن کیا ہوا؟

یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اُردو کا ہر بہی خواہ اس بات سے واقف ہے۔ البتہ کیا نہیں ہوا؟ یہ کوئی پوچھے۔ خود اردو سے پوچھئے۔ ان بائیس برسوں سے پوچھئے جو اردو کی تاریخ میں، نہیں اُردو کے سفر میں، نہیں اردو کی زندگی میں بہار بن کر آئے یا خزاں بن کر!

لمحے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ ہر گذرتا ہوا لمحہ وقت کی ایک تاریخ ہوتا ہے۔ لمحہ گذر جاتا ہے۔ لیکن اپنے پیچھے ایک ان مٹ نقش، ایک تاریخ چھوڑ جاتا ہے۔ تاریخ اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن تاریخ کا لکھنے والا مورخ جھوٹا ہے۔ کیونکہ وہ واقعات کو موڑ توڑ کر پیش کرتا ہے۔ لیکن اس زندہ حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آزادی کے بعد اُردو اپنی ہی جنم بھومی اور اپنے ہی وطن عزیز ہندوستان میں ایک رفیوجی کی طرح آوارہ گھوم رہی ہے!

اس خصوص میں مجھے خواجہ احمد عباس کا ایک دلچسپ طنزیہ تمثیلی خاکہ یاد آتا ہے جس میں انھوں نے اردو کو ایک خوبصورت جوان لڑکی کے روپ میں پیش کیا تھا۔ اور جس سے ہر چھوٹا بڑا آدمی عشق کرتا ہے۔ لیکن کوئی

www.taemeernews.com

اسے اپنانا نہیں چاہتا۔ محض اس لیے کہ لوگوں کے خیال میں اردو ایک ناجائز اولاد ہے۔ اور کوئی اس کے باپ سے واقف نہیں۔ لہٰذا دن کے اجالے میں جہاں کہیں وہ جاتی ہے ٹھکرا دی جاتی ہے۔ لیکن راتوں میں ہونے والے تہذیبی پروگراموں اور مشاعروں میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ مصنف کے اس طنز کے پیچھے کیا ایک تلخ حقیقت نہیں؟

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن اس ناجائز اولاد کے باپ کا پتہ اب تک نہ چل سکا۔ مصنف اپنے چبھتے ہوئے طنز میں بجا طور پر حق بجانب ہے۔ اب مصنف یا میں یا آپ مخالف قوتوں کو کیسے یقین دلا سکتے ہیں کہ اردو جائز اور حلال کی اولاد ہے۔ اور اس کی سات سو سالہ تاریخ میں اس کی ماں اور باپ دونوں کا پورا شجرہ درج ہے۔ یہ نجیب الطرفین ہے۔ اور یہ ایک تاریخی سچائی ہے۔ مگر کوئی اس عالمگیر سچائی کو ماننے سے ہی انکار کر دے تو اس کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے!

ماضی کی ایک ایک بات مجھے یاد آگئی!

اور میں نے سوچا، اردو کتنی سخت جان ہے جو اب تک زندہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے بولنے والے بھی۔

اردو بدیسی زبان ہے!

اردو فرقہ پرستوں کی زبان ہے!!

یہ ایک خطرناک سیاسی افواہ تھی جو سارے ملک میں پھیلا دی گئی ان مخالف سماج قوتوں کی طرف سے جو سوشلزم، سیکیولرازم اور کسی انسانی قدر

www.taemeernews.com

پر بھروسہ نہیں رکھتے۔

اور اردو کو سب سے زیادہ نقصان اسی افواہ سے پہنچا!

افواہ کے پیچھے نہ کوئی منطق ہوتی ہے۔ اور نہ اس کے آگے کوئی استدلال۔ افواہ صرف افواہ ہوتی ہے۔ اور اس لئے ہوتی ہے کہ پھیلائی جائے افواہ پھیلانے کے لیے نہ تو ریڈیو کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ اخبارات کی۔ بلکہ یہ سکنڈوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ جنگل کی آگ کو فائر بریگیڈ کی مدد سے بجھایا جاسکتا ہے۔ لیکن افواہوں سے جو آگ پھیلتی ہے اسے کیسے بجھایا جائے! کیونکہ یہ دلوں کے اندر، جذبات کے اندر اور احساسات کے اندر ہی اندر پھیلتی ہے۔ اور ایک عام آدمی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ عام آدمی جو معصوم ہوتا ہے اور کسی سازش سے واقف نہیں ہوتا۔ اس کے کانوں میں کسی نے چپکے سے کہہ دیا ——————

ہشیار —— اردو مسلمانوں کی زبان ہے:

ہشیار —— اردو مسلمانوں کی زبان۔ ہے!!

ہشیار —— اُردو مسلمانوں کی زبان۔ ہے!!!

اور مخالف سماج قوتیں اُردو کے خلاف اس سازش میں کامیاب ہوگئیں۔ اور اس کا سب سے زیادہ اثر اس معصوم اور نئی نسل پر پڑا جس نے آزادی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اور وہ بھی نفرت اور تعصب کی اس آگ میں جھونک دی گئی۔

ہائیس سال کے بعد ہی میں یہ سوچا آخر وہ لمحہ آ پہنچ گیا۔ وہ لمحہ

www.taemeernews.com

جس کا نہ جانے کب سے انتظار تھا۔ سالہا سال کے تھکا دینے والے صبر آزما انتظار کے بعد اردو کے ادیب، شاعر، نقاد اور دانشور اپنے تمام آپسی اختلافات کو بھول کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے ہیں۔ اردو کے حق میں اُردو کی یہ پہلی کامیابی ہے کہ اس کے چاہنے والے اور اس کے دوست متحد ہو گئے ہیں!

منعقد ہونے والے آل انڈیا اُردو کنونشن کی دوسری بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ملک کی دوسری تیرہ زبانوں کے اہم ادیب اور دانشور اردو کے مطالبے کی تائید کے لئے دُور دُور سے آرہے تھے ــــــ

اردو کنونشن کا دعوت نامہ قبول کرتے ہوئے میں نے صدر کمیٹی کرشن چندر کو خط لکھا۔ اور انہیں اس اقدام پر مبارکباد دی۔ ساتھ ہی کنونشن کے سکریٹری سید محمد زیدی کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔

ویسے دعوت کے مطابق مجھے ۲۷ ر ڈسمبر کی شام کو بمبئی پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ اور ۲۷ ر کی شام کو بلانے کا مقصد یہی تھا کہ دور دور سے آنے والے ڈیلیگیٹس آرام کر سکیں۔ اور صبح تازہ دم ہو کر اجلاس میں شریک ہو سکیں۔ لیکن کچھ مصروفیت کی وجہ سے میں اسی دن پہنچا جس دن سے کنونشن شروع ہونے والا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ ۲۸ ر ڈسمبر کی صبح تھی جب کہ میری ٹکسی بمبئی کی چمکیلی اور خاموش سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ ہلکا ہلکا ملگجا اجالا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ چوراہوں پر استادہ بڑے بڑے رہنماؤں کے قدآدم بت اپنا چھپا بھیٹی

www.taemeernews.com

نگاہوں سے نہ جانے کیا گھور رہے تھے!

ہر بُت کے چہرے پر تھکاوٹ تھی۔ مایوسی تھی۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سب کسی ایک ہی سوچ میں گم ہیں۔ اور جس کسی بت کے ہونٹوں پر آرٹسٹ نے ترشے فن کارانہ انداز میں مسکراہٹ سجا دی تھی وہ بت بھی آرٹسٹ کا مذاق اڑاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہر چہرا ہے اور ہر موڑ پہ بت ملتے گئے۔ اور میں ان سے ملتا گیا۔ لیکن کسی سے مل کر خوشی نہ ہوئی۔ نہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سب کسی روحانی کرب اور عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور اپنی خاموش زبان میں کہہ رہے ہیں، ہمیں یہاں سے اٹھالو۔ اب ہم کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ سن نہیں سکتے برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر ہمیں کیوں یہ تکلیف دی جارہی ہے۔ کیا ہماری بے غرض خدمات کا یہی انعام ہے؟

معلوم نہیں ان سب بے چاروں نے کیا کیا دیکھا اور کیا کیا سنا!

دور تک سڑکوں پر جیسے سناٹا تھا!

ابراہیم رحمت اللہ روڈ تک پہنچتے پہنچتے دھوپ نکل چکی تھی۔ وکٹوریہ والے نے وکٹوریہ روکتے ہوئے پوچھا بتائیے کہاں چلنا ہے؟

اردو کمیٹی کا دفتر!

میں نے کہا اور وکٹوریہ والے نے کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ مجھے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جیسے وہ اردو کمیٹی کے دفتر سے واقف نہیں بلکہ ہر اس فرد سے شخصی ربط رکھتا ہے جو اس سے وابستہ ہے۔ اور میں شاید اس کے لئے اجنبی تھا۔

اسے خاموش دیکھ کر میں نے اس سے کہا ــــ

کوئی بات نہیں۔ یہاں کسی سے پوچھ لیں گے ــــ

www.taemeernews.com

وکٹوریہ والے نے فوراً جواب دیا "نہیں صاحب دوسروں سے کیوں پوچھیں گے۔ میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کہیں اس دفتر کو تو نہیں پوچھ رہے ہیں جس کے ایک جلسہ کی صدارت ہمارے ملک کی وزیراعظم اندرا گاندھی کرنے والی ہیں۔

ہاں —— ہاں —— اسی دفتر کو تو میں پوچھ رہا ہوں۔

وکٹوریہ والے کی سیدھی صاف اُردو سُن کر جہاں مجھے خوشی ہوئی وہیں اُردو کمیٹی کی طرف سے ہونے والے جلسے کے بارے میں اس کی دلچسپی دیکھ کر میں جیسے جذباتی ہو گیا!

بھائی تمہارا نام

بڈھن خاں

وکٹوریہ والے نے مجھے بتایا۔ اور یہ بھی بتایا کہ وہ مڈل فیل ہے۔ اُردو اخبارات پڑھ لیتا ہے۔ شہر میں ہونے والے ہر جلسے کی خبر وہ دیواروں پر چسپاں بڑے بڑے پوسٹروں پر پڑھ لیتا ہے۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ میں بھی اسی اجلاس میں شرکت کی غرض سے آیا ہوں تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے سوٹ کیس اٹھانے میں میری مدد کرتے ہوئے پوچھا ——

صاحب کیا کچھ بات بنے گی ؟

میں نے کہا، کیوں نہیں !

بڈھن خاں کی اس جذباتی وابستگی کا کسی کے یہاں کوئی جواز ہو یا نہ ہو لیکن میرے لئے قابل احترام تھی۔ اردو کے اچھے یا بُرے موقف کا یقیناً اس پر کوئی اثر پڑ سکتا تھا۔ اور نہ براہ راست اُردو کا تعلق اس کے پیٹ سے تھا۔ لیکن اس کے خوابوں کا محل یقیناً اُردو کی بقا پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے یوں محسوس

www.taemeernews.com

کیا جیسے وہ اُردو کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہے بلکہ اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ اپنے پوتے کے بارے میں پوچھ رہا ہے جس کا کوئی وجود نہیں لیکن جو اس کے تصور میں اور اس کے ننھے بچے کی معصوم مسکراہٹوں میں جیسے سانس لے رہا ہے۔ اور جو اس کی جوان بیوی کی لوریوں میں پیدا ہوگیا ہے۔

وکٹوریہ سے سامان اتارنے میں بڈن خاں نے میری مدد کی۔ مدد کیا بلکہ اس نے ایسا سلوک کیا جیسے میں اُردو کمیٹی کا مہمان نہیں بلکہ اس کا مہمان ہوں۔ کرائے کے پیسے لیتے ہوئے بھی وہ بڑا ہچکچا رہا تھا۔ شرما رہا تھا جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو رہا ہو۔

بڈن خاں چلا گیا۔ لیکن بڑی دیر تک اس کی مسکراہٹ میرے ذہن کے آسمان پر چمکتی رہی!

اُردو کمیٹی کا دفتر بڑا مختصر تھا۔ کرسیاں بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ چند نوجوان آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ کوئی آ رہا تھا۔ کوئی جا رہا تھا۔ اور کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ نئے آنے والے کے بارے میں کچھ پوچھا جائے۔ میز پر جھکا ہوا ایک نوجوان ان تمام چیزوں سے بے خبر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ نوجوان کا رنگ کھلا، شخصیت پرکشش اور چہرے پر ایک باوقار سنجیدگی تھی۔

معاف کیجئے میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں!

قریب پہنچ کر میں نے کہا۔

نوجوان ایک لمحہ کے لئے رُک گیا اور چونک کر اس نے مجھے دیکھا۔ اور پھر ایک اجنبی کا جس طرح مسکراتے ہوئے استقبال کرنا چاہیئے نوجوان نے

www.taemeernews.com

اسی روایتی اخلاق کو برتتے ہوئے کہا۔۔

کوئی بات نہیں ـــــ فرمایئے ـــــ

میں اردو کمیٹی کے سکریٹری سید محمد زیدی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

فرمایئے۔ میں زیدی ہوں۔

نوجوان نے جیسے اپنا تعارف کرایا۔ پھر میں نے کہا۔

میں عاتق شاہ ہوں۔

زیدی صاحب کرسی سے اٹھ گئے۔ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ میری آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ اور پوچھا، کیا اسٹیشن پر ہمارے والنٹیر آپ سے نہیں ملے۔؟

ظاہر ہے کسی والنٹیر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور پھر اتنے بڑے کنونشن کے انعقاد میں ایسی بھول چوک ممکن ہے۔ اس کے باوجود زیدی صاحب نے معذرت چاہی۔ اور مجھے دو نوجوان والنٹیر کے حوالے کر دیا۔ جو دیکھنے میں کسی کالج کے طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ مجھے اس مقام پر پہنچا دیں جہاں سب مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام تھا۔

ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے مہمانوں کو اسلامیہ کالج کی نئی بلڈنگ میں ٹھہرایا گیا تھا اور اسلامیہ کالج اردو کمیٹی کے دفتر سے کوئی دو فرلانگ دور تھا۔ میں جس وقت پہنچا وہاں کوئی نہ تھا۔ سب ناشتہ کے بعد پہلے اجلاس میں شرکت کی غرض سے جا چکے تھے۔ مہمانوں کے سوٹ کیس، بستر اور دوسرے سامان، بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رفیوجی کیمپ کا ایک حصہ ہے۔ یا ایک ملٹری بیارک ہے جہاں

www.taemeernews.com

ہر سپاہی کی ملکیت ایک سوٹ کیس، ایک بستر اور ایک جوڑ سینڈل پر مشتمل ہوتی ہے۔ سوٹ کیس اسی انداز میں رکھ کر میں بھی غسل خانہ کا رخ کیا۔ کپڑے بدل کر جب میں ہال کے باہر آیا تو میں نے دیکھا وہی دو والنٹیر مجھے جلسہ گاہ میں لے جانے کے لئے میرے منتظر کھڑے ہیں۔

ناشتہ کے بعد ان نوجوانوں نے مجھے ایک اسکول بس میں بٹھا دیا جو خصوصیت کے ساتھ مہمانوں کے لئے مختص کی گئی تھی۔ اور جسے میں نے کالج کی باؤنڈری میں قدم رکھتے ہی دیکھا تھا۔

بس میں اور بھی لوگ تھے۔ سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی۔ لیکن سب اُردو کے کاز کے لئے آئے تھے اور یہی ایک شئے مشترک تھی جو ذہنی طور پر انہیں ایک دوسرے کے قریب لائی تھی۔ اس کے باوجود وہ سب خاموش خاموش، انجان اور کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سب کے سب صرف ایک کی ہی بات سوچ رہے ہیں۔ اور وہ اُردو کے مستقبل کی بات تھی!

سگریٹ جلا کر میں نے سڑک پر نگاہ ڈالی!

کہہ تو نہیں سکتا کہ وہ پرشور ندی کی طرح بہتی ہوئی چمکیلی سڑک کون سی تھی جس پر ہماری بس گذر رہی تھی۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مشینی زندگی کی ہڑبونگ سے یہ بھی خالی نہ تھی۔ کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ ہزاروں اور لاکھوں لوگ ایک دوسرے کے ہمراہ اور ایک دوسرے سے الگ مخالف سمتوں میں آ اور جا رہے تھے۔ دھوپ میں تیزی آ رہی تھی۔ دن بڑھ رہے تھے۔ آدمی اور مشین کی رفتار میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود آدمی آدمی ہوتا ہے۔ اور مشین، مشین لیکن جب آدمی مشین بننے کی کوشش کرتا ہے تو

www.taemeernews.com

وہ نہ مشین بنتا ہے اور نہ آدمی باقی رہتا ہے۔ بلکہ کوئی اور شے ہو جاتا ہے بشاید ایک لاش۔ چلتی پھرتی ہوئی ——

بور ہو کر میں نے سگریٹ پھینک دیا۔

بس رکتے ہی پتہ چلا کہ منزل آ گئی ہے۔ مہمان آہستہ آہستہ اُترنے لگے ——

یہ ساہو صدیقی پالی ٹکنک کا المالطیفی ہال تھا۔

ابھی ہال بھرا نہیں تھا اور نہ اس کی کوئی امید تھی۔ کیونکہ یہ جلاس دور دور سے آنے والے ڈیلی گیٹوں کے لئے مختص تھا۔ تاکہ وہ میمورنڈم کے ہر اس پہلو پر غور کرلیں جسے پنڈت آنند نرائن ملا دوسری صبح ہندوستان کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی خدمت میں پیش کرنے والے تھے۔ جلسہ کی کارروائی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ جلسہ اب شروع ہوا چاہتا ہے۔

اچانک مائک پر ایک صاحب آئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ ڈیلیگٹس اپنے بیاج اسی ترتیب سے حاصل کرلیں جیسے جیسے نام پکارے جائیں۔ یہ نام صوبہ داری بنیادوں پر پکارے جارہے تھے ——

یوپی —— بہار —— دہلی —— کشمیر

اور پھر حیدرآباد

حیدرآباد سے پروفیسر حبیب الرحمٰن، عابد علی خاں، احمد جلیس اور اظہر افسر آئے تھے۔

اور میں؟

میں حیدرآباد کا تھا۔ لیکن میرا نام مہاراشٹرا کے ضلع ناندیڑ کے

www.taemeernews.com

نمائندے کی حیثیت سے پکارا گیا۔ کیونکہ میری ملازمت نا ندیڑ میں تھی۔ اور جیسے ہی میں ملازمت کے سلسلے میں نا ندیڑ گیا میرا نام میرے وطن حیدرآباد کے رجسٹر سے کاٹ دیا گیا۔ اس سے پہلے بھی میرے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ اور میں بنگلور کی اونچی نیچی سڑکوں پر ایک اجنبی کی طرح گھومنے لگا۔ اور کنڑی بولنے والے عوام مجھے شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک شام بنگلور کی جھک جھک جمکتی ہوئی کمرشیل اسٹریٹ کی تیز روشنی میں چلتے چلتے میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اور اسی لمحے میں نے خود سے سوال کیا ——— میں کون ہوں؟

میں جاپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا بھی تھا تو اپنے بارے میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ شاید اپنا نام بھی۔ ایک چیخ میرے وجود کے کھنڈروں میں گونجتی ہی چلی گئی ———

آخر میں کون ہوں ——— کون ہوں؟

کمرشیل اسٹریٹ ہی کیا۔ اس پر گذرنے والے کسی مرد اور عورت نے میری آواز نہیں سنی۔ کون کس کی آواز سنتا ہے۔ ہر لیونگ کی اپنی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو اس کا کوئی مفہوم ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی لَے۔

پھر ایک صبح جب میں میسور اسٹیٹ کے دارالخلافہ بنگلور سے عظیم آندھرا پردیش کے دارالخلافہ حیدرآباد منتقل ہو گیا تو پھر میرا نام میرے وطن والوں نے اپنے رجسٹر میں لکھ لیا۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تھا کہ ملک کی لسانی بنیادوں پر تقسیم کے ساتھ ہی تہذیب کی، اخلاق کی، وفاداری کی، شہرت کی اور آدمیت کی تقسیم ہوئی تھی۔ جو جس صوبہ میں چلا گیا وہی اس کا وطن کہلایا اور

www.taemeernews.com

جہاں وہ پیدا ہوا اس کا اس سے کسی طرح کا بھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس طرح لوگ صوبوں کی اصطلاحوں میں سوچنے لگے تھے۔ حالانکہ سب سے پہلے ہم ہندوستانی ہیں۔ اس عظیم ملک ہندوستان کے شہری اور بعد میں سب کچھ محض زبان کا فرق ان کی آپس کی دوستی اور وطنیت کو دھکا نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن ایسا ہوا۔ اور اردو بولنے والا نہ یہاں کا رہا اور نہ وہاں کا ــــــ

اور آج مختلف صوبوں کے نمائندے اسی لئے آئے تھے کہ اپنے اپنے صوبے میں اردو کی پوزیشن پر غور کریں۔ اور متحدہ طور پر اردو کے کاز کو آگے بڑھائیں۔

ڈائس کے قریب پہنچ کر میں نے اپنا بیاج حاصل کیا۔

میری طرح اور بھی کئی حضرات اپنا اپنا بیاج حاصل کر کے نشستوں پر بیٹھ گئے۔

اردو کے ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر نے کرسی صدارت سنبھالی۔

اور اس کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر اور مشہور اردو شاعر پنڈت آنند نرائن ملا میک پر تشریف لائے۔ اور ایک مختصر سی تقریر کے بعد انہوں نے وہ یادداشت پڑھی جو انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ اور قل اسکیپ کے (۸) صفحات پر مشتمل تھی۔ اور جو دوسری صبح وزیر اعظم صاحبہ کی خدمت میں پیش کی جانے والی تھی۔

بڑے سکون اور خاموشی کے ساتھ حاضرین جلسہ نے یادداشت کو سنا۔ بعض حضرات وقتاً فوقتاً کچھ پائنٹس بھی نوٹ کرتے جا رہے تھے۔ اور جو پائنٹس نوٹ نہیں کر رہے تھے وہ بڑے غور سے سن رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اردو ان سب کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی ہے۔

www.taemeernews.com

یادداشت کے اہم پائنٹ یہ تھے :

ہم مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ ہندی علاقوں میں لسانی اقلیتوں کے حقوق کا حکومت کی طرف سے جب تک تحفظ نہ کیا جائے اردو بولنے والوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس کے سوا اور کوئی دوسری صورت نہیں ہے کہ اردو کو دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ان ریاستوں میں دوسری "علاقائی زبان" قرار دیا جائے۔

نظم و نسق کے اتحاد کے لیے فاشسیٹ طریقوں کو اپنا کر کسی زبان کو تباہ کرنا ایک زبان کا قتل ہے۔ اس سے نہ صرف ملک میں رہنے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد اپنے ہی وطن میں اجنبی بن کر رہ جائے گی بلکہ وہ ترقی کی جد و جہد میں پیچھے رہ جائے گی۔

اردو دنیا کی مسلمہ زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ دنیا کی ایک اہم زبان کو جسے کروڑوں لوگ بولتے ہیں دوسری علاقائی زبان بننے کے لئے ان شرائط کی تکمیل کرنی پڑے گی جہاں وہ پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ کیا اس دلیل کے پیچھے کوئی منطق ہے کہ کوئی زبان محض اس بنا پر علاقائی زبان قرار دی جائے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ جب کہ اس کے بولنے والے اردو بولنے والوں سے تعداد میں نصف ہیں۔ اور اردو اس حق سے محض اس لئے محروم رکھی جاتی ہے کہ وہ سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

www.taemeernews.com

جیسے ہی ملا صاحب مائیک سے ہٹے ہال میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ غالباً ہر ڈلیگیٹ اپنے ساتھی سے یادداشت کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ صدر کی آواز کے ساتھ ہی پھر ایک بار تمام سننے والوں کی توجہات ڈائس کی طرف منعطف ہوگئیں۔ صدر صاحب حاضرین جلسہ کو یادداشت پر اظہار خیال کی دعوت دے رہے تھے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اب جب کچھ کہنے کی نوبت آئی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر فرد اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ بات جو محفل میں بیٹھ کر اپنے پڑوسی سے کہی جاسکتی ہے وہی سب کے سامنے کیوں نہ دہرائی جائے۔ شاید اس کے لئے وہ اعتماد کی ضرورت ہے جو عام طور پر مفقود نظر آرہا تھا۔ بعض حضرات کچھ اس انداز سے بھی اپنے آپ کو بچا رہے تھے کہ بھائی یہاں پہلے میمورنڈم کی اسٹڈی کرنی ہوگی۔ اس کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اور بعض اپنے پڑوسیوں سے خواہش کر رہے تھے کہ آپ جاکر کچھ کہئے نہ ——

اس کے باوجود صدر کے پاس کئی ناموں کی چٹھیاں پہنچ چکی تھیں جو اس موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے۔ جیسے جیسے نام پہنچتے گئے۔ ویسے ویسے اسی ترتیب سے صدر صاحب نام پکارتے گئے ——

سب سے پہلے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب مائیک پر تشریف لائے۔ بحث کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر مجیب نے میمورینڈم کے بعض فقروں کو سخت قرار دیا۔ اور کہا کہ جب ہم ٹھنڈے انداز میں اپنے مطالبات کو منوا سکتے ہیں تو کیوں سخت لب ولہجہ اختیار کریں آخر میں انہوں نے تجویز پیش کی کہ ان فقروں کے چند حصے حذف کر دیئے

www.taemeernews.com

جائیں۔

حیدرآباد کے پروفیسر حبیب الرحمٰن نے ان فقروں کو حذف کرنے پر زور دیا جن سے طنز کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف حیدرآباد کے عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں میمورینڈم کو نیاز مندانہ بتایا اور اس کی طوالت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ میمورینڈم کو مختصر ہونا چاہیئے۔

ان کے علاوہ حمید سلطان، بیگم انیس قدوائی اور حیات اللہ انصاری نے بحث میں حصہ لیا۔

اب تک صرف دو ہی نقاط نظر سب کے سامنے آئے تھے۔ ایک وہ نقطۂ نگاہ جس کے پیچھے دور اندیشی تھی۔ پھونک پھونک کر اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے کی ہدایت تھی۔ ماضی کا سخت تجربہ تھا اور آنے والے دنوں کا خوف۔ قریب قریب تمام معمر بزرگ حضرات کا میمورینڈم کے تعلق سے یہی رویہ تھا۔ لیکن نیا خون اس دور اندیشی اور سمجھوتہ بازی کا قائل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر جرأت سچ ہے اس کے اظہار کے لئے پس وپیش کیوں؟

والنٹیر کے ذریعہ میں نے اپنا نام بھجوایا!

میں نے سوچا۔ نہیں میں نے اپنے تئیں طے کیا کہ مجھے بغیر کسی ذہنی

www.taemeernews.com

تحفظ کے وہ تمام باتیں کہنی چاہئیں جو میرے دل میں ہیں اور جس کا بڑی حد تک میمورینڈم میں کسی اور کے توسط سے اظہار ہوا ہے۔

لیکن میرا نام پکارے جانے سے پہلے میرے دوست قاضی سلیم ڈائیس پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں میمورینڈم کا جائزہ لیا۔ اور اپنی گونجیلی آواز میں کہا کہ اگر سیاسی بحث میں الجھے بغیر مقصد حاصل نہیں ہوتا تو ہمیں سیاست کو بیچ میں لانے سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میمورینڈم میں نئے ذہن کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات کا اعتراف اور احساس بھی ملتا ہے۔

قاضی سلیم کی تقریر کے اختتام پر ہی میں نے اپنا نام واپس لے لیا۔ میں نے یوں محسوس کیا کہ قاضی نے بڑی جرأت، بے باکی اور ایمانداری کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو قاضی سلیم کے احساسات ہر اردو لکھنے پڑھنے والے کے احساسات تھے۔

ظاہر ہے اس حقیقت پسندانہ تقریر کا اثر سامعین پر بڑا اچھا ہوا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بزرگ ادیب اس کی تائید میں نہیں تھے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

میرے اندر سے ایک آواز آئی۔ ساتھ ہی میں نے سوچا، کیا یہ بزرگ اپنے مبہم اور غیر یقینی رویے سے خواہ اس کے پیچھے کتنی ہی اچھی نیت کیوں نہ ہو اُن عزائم کی تکمیل میں حصہ نہیں لے رہے ہیں جو زبان اور کلچر کے دشمن ہیں!

یہ صحیح ہے اور اس سے ہر پڑھا لکھا شخص اتفاق کرے گا کہ

www.taemeernews.com

زبان اور کلچر کو سیاست سے نہیں ملانا چاہیئے۔ لیکن سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہر بات سیاست سے شروع ہو کر سیاست پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ کسی فرد کی نجی زندگی کو سیاسی عینک سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر روٹی روزگار مانگنے والا کمیونسٹ ہے۔ ہڑتال کرنے والا غنڈہ ہے۔ لکھنے پڑھنے والا اور زبان کی سہولتیں مانگنے والا شر پسند ہے تو بھلا اس کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے!

کیا کسی ملک کے شہری کا یہ پیدائشی حق نہیں ہے کہ وہ اپنی مادری زبان میں لکھنے کی سہولتیں مانگے۔ اور روزگار حاصل کرے۔ کیا دنیا کی کوئی پارلیمانی جمہوریت اس حق کو جھٹلا سکتی ہے؟

اس کا جواب شاید ہر اردو بولنے اور لکھنے والے کے دل میں تھا۔

لیکن صدر جلسہ کرشن چندر نے اسے بڑی وضاحت سے پیش کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر اردو کی جنگ میز پر حل نہ ہوئی تو میدانوں میں لڑی جا سکتی ہے۔ جمہوری سوشلزم کے راستے ہمیں انصاف حاصل کرنے کی امید میں صرف خاموش نہیں بیٹھنا چاہیئے بلکہ اس کے لئے ہمیں جدو جہد کرنی ہوگی۔ اور اپنی مانگیں پیش کرتے ہوئے ہمیں ہچکچانا نہیں چاہیئے۔

آخر میں سجاد ظہیر مائیک پر آئے۔ حاضرین نے سمجھا کہ وہ ایک لمبی چوڑی تقریر کریں گے۔ لیکن انہوں نے ایک ہی فقرہ کہا۔ ان کا فقرہ یہ ہے۔ میں میمورینڈم سے اتفاق کرتا ہوں۔ اردو کی جنگ ہر محاذ پر لڑنی ہے۔

تین گھنٹوں کی گرما گرم بحث کے بعد اجلاس ختم ہوا اور تمام

www.taemeernews.com

ڈیلی گیٹ لنچ کے لئے اسلامیہ کالج کی طرف روانہ ہو گئے۔

شام میں دوسرا اجلاس اکبر پیر بھائی ہال میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ صبح کی بحث و مباحثہ کی روشنی میں کوئی راہ متعین کی جائے۔ :ر. یادداشت کے مسودہ کو قطعیت دی جائے۔

اس جلسہ کی صدارت شری ہری کرشنا مہتاب نے کی۔ اور بحث کا آغاز ڈاکٹر ملک راج آنند نے کیا۔ آپ نے اردو کے مطالبے کو مختصر بتاتے کی حمایت کی۔ صبح کے اجلاس میں اسی خیال کو حیدرآباد کے عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شرما نے مطالبہ میں مزید تبدیلی پر زور دیا۔

حیات اللہ انصاری نے میمورینڈم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اور جدوجہد کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سخت الفاظ کا استعمال دشواریاں پیدا کرے گا۔

اس سے پہلے یہی بات پروفیسر مجیب الرحمٰن اور پروفیسر حبیب الرحمٰن نے صبح کے اجلاس میں کہی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ وہی بات دوسرے الفاظ میں دہرا دی گئی۔

اپنی تقریر کے دوران حیات اللہ انصاری نے رسم الخط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے نیا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔ اور انگریزی یادداشت میں استعمال کئے ہوئے لفظ "ریجنل" سے یہ خیال پیدا ہوگا کہ اردو والے نیا علاقہ مانگ رہے ہیں۔

www.taemeernews.com

بھئی حد ہوگئی ڈر اور خوف کی۔ وہ بات جس کا ذکر سارے فسانے میں نہیں وہ آخر ان کے ذہن میں کہاں سے آگئی!

اُردو کا علاقہ اس وقت نہیں مانگا گیا جبکہ لسانی بنیادوں پر ہندوستان کا ایک نیا نقشہ بن رہا تھا۔ اس وقت اردو بولنے والے یہ سوچنے کی جرارت بھی نہ کرسکے کہ اس نئے نقشہ میں ان کی زبان کا اور ان کا کیا مقام ہوگا شاید اس لیے کہ کوئی انہیں غلط نہ سمجھے اس وقت اکثر و بیشتر اُردو بولنے والوں کی زبان مفلوج ہوگئی تھی۔ جب سرکاری آدمی نے مردم شماری کرتے ہوئے ان سے ان کی اپنی زبان کے بارے میں دریافت کیا تھا۔
اس پس منظر میں بھلا ایسی بات سوچ لینا ظاہر ہے اصل مفہوم کی غلط تعبیر ہے!
درحقیقت یہ خوف ایک ایسی نفسیاتی توضیح چاہتا ہے جو اس کی تہہ تک پہنچ سکے۔ شاید اردو بولنے والے اور لکھنے پڑھنے والے اس شخص سے بے حد مشابہ ہیں جو خوف کی آخری منزل پر خود اپنے سائے کو دیکھ کر چیخنے لگا ہے!

ہندی کی مشہور ادیبہ مسز چوہان نے اسی خوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کھری کھری سنائی۔ اور کہا کہ اردو والے اپنے صاف سیدھے مطالبے کو واضح الفاظ میں پیش کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ایک لفظ پر رکتے اور جھجکتے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں ہم دوسری زبانوں کے ادیبوں کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟
مسز چوہان جب اس فقرہ کو ختم کرچکیں تو ستنے والوں کو جیسے

www.taemeernews.com

سانپ سونگھ گیا۔ اور کسی ڈیلی گیٹ میں اتنی اخلاقی جرارت نہ تھی کہ اس سوال کا جواب دے سکے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہندی کی اس بے باک ادیبہ نے ہر ایک کو اس کا اپنا صحیح چہرہ دکھایا ہے۔ آخر میں مسز چوہان نے اردو والوں کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو جرارت سے کام لینا ہوگا۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اردو کے لئے انصاف حاصل کرنے کا خیال ترک کر دینا چاہیے!

سننے والوں پر اس تقریر کا بڑا اچھا اثر ہوا۔ حد یہ کہ ایوان کی ساری فضا دیکھتے ہی دیکھتے بدل گئی۔ اور بحث کا رخ دوسری طرف ہو گیا۔ چنانچہ سندھی، اڑیہ، تلگو، مراٹھی، بنگالی اور دوسری زبانوں کے ممتاز ادیبوں نے پُر زور الفاظ میں اردو کے مطالبے کی تائید کی اور اردو والوں کا حوصلہ بڑھایا اور انہیں یقین دلایا کہ ان کا مطالبہ ایک سکیولر مطالبہ ہے اور اسے پیش کرتے ہوئے گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں۔

آخر میں ایوان نے متفقہ طور پر یہ رائے دی کہ میمورینڈم میں ہلکی سی ترمیم اور رد و بدل کے مسئلے کو جناب آنند نرائن ملا پر چھوڑ دیا جائے۔

صبح سے شام تک بے حد مصروف وقت گذارنے کے بعد ہلکی سی تھکن کا احساس ایک نشہ بن کر اعصاب اور روح پر چھا رہا تھا۔ اچھے ڈنر کے بعد ایسے نشہ کا احساس اور کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے۔ ڈنر کی میز سے لے کر بستر تک یادداشت ہی موضوع بحث رہی۔ میرے ہال میں کچھ پہاڑی نمائندے بھی تھے۔ اور وہ اونچی اونچی آوازوں میں اظہار خیال

www.taemeernews.com

کر رہے تھے۔ لیکن آوازیں کچھ اس طرح گڈمڈ ہوگئی تھیں کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ کیوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ البتہ ایک لفظ وقفے وقفے سے صاف سنائی دے رہا تھا۔

اُردو ——— اُردو ——— اُردو !!

لحاف اوڑھ کر میں لیٹ گیا۔ لیکن میرا ذہن ایک آزاد پرندے کی طرح نہ جانے کہاں کہاں پرواز کرتا رہا۔ بمبئی کی سرزمین پہ مجھے قدم رکھے ہوئے بہ مشکل سولہ گھنٹے گذرے ہوں گے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس شہر سے میرا دیرینہ یارانہ ہے۔ یہاں کی ہر شئے مجھ سے اور میں ہر شئے سے واقف ہوں۔ جہاں جاؤ۔ جدھر جاؤ، وہیں سے بات کرو سارادو کی آواز کانوں میں گونجتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اہلیانِ بمبئی اردو کا جشن منا رہے ہیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹرس، اخباروں میں دو دو کالم کی سرخیاں اور سڑکوں پر خیر مقدمی کمانوں پہ جلی حرفوں میں اردو کے اشعار ستاروں کی طرح چمک چمک چمک رہے تھے۔

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

اتنا ایسے کئی اشعار جو کمانوں کے قریب سے گذرنے والے سینکڑوں افراد کو دعوتِ فکر دے رہے تھے!

اس گہما گہمی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ برسرِ اقتدار کانگریس کا تاریخی اجلاس بمبئی میں ہو رہا تھا۔ اور اردو کنونشن بھی۔ جس دن کانگریس کا آخری اجلاس تھا اس کے دوسرے دن سے ہی اردو کمیٹی کی طرف سے

www.taemeernews.com

آل انڈیا اُردو کنونشن شروع ہونے والا تھا۔ اس لئے آج دن بھر بمبئی میں غیر معمولی رونق اور چہل پہل رہی اور آج کی شام اس طرح بھی اہم اور تاریخی تھی کہ ہندستان کی وزیر اعظم نے کانگریس کے آخری اجلاس میں دس لاکھ کے عظیم اجتماع میں اعلان کیا کہ ہم اُردو کو وہی مقام دینا چاہتے ہیں جو ملک کی دوسری زبانوں کو حاصل ہے!

کیا اُردو کو اس کا اپنا مقام ملے گا؟

کئی آوازوں میں سے ایک آواز ہال میں ابھری!

اور پھر ایک ثانیہ کے لئے جیسے سناٹا چھا گیا۔ جیسے ـــــ جیسے ـــــ جیسے کسی نے کوئی بے تکی بات پوچھ لی تھی۔ اور بے تکی بات پوچھ کر سارا مزہ کرکرا کر دیا تھا!

سردی میں ٹھٹھری ہوئی رات ایک پردیسی کی طرح آہستہ آہستہ تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنا راستہ طے کر رہی تھی۔ سمندر سے آنے والی ہواؤں میں رطوبت پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں خود کو لحاف میں لپٹا ہوا ان آوازوں کو سن رہا تھا۔ جو میرے وجود کے اطراف اٹھ رہی تھیں!

کیوں نہیں ملے گا۔ ضرور ملے گا ـــــ ضرور!

ایک ساتھ تین چار آوازیں اٹھیں!

اور میں نے سنا ایک صاحب بڑے یقین کے ساتھ کہہ رہے تھے، صاحب ہم اُردو کے لئے بھیک نہیں مانگ رہے ہیں۔ بلکہ اس کا حق مانگ رہے ہیں۔ اور یقین ہے کہ ہمیں حق ملے گا۔ اور پھر ہماری وزیر اعظم کے لئے یہ حق دینا ایک معمولی سی بات ہے۔

www.taemeernews.com

اس کے بعد انہوں نے رک کر کہا، غور کیجیے، جو شخصیت بنگال کو قومی ملکیت بنا کر اچھے اچھے سورماؤں کے چھکے چھڑا سکتی ہے اس کے لئے اُردو کا حق دینا کون سی مشکل بات ہے!

اور پھر آج شام کا اعلان تو بہت ہی صاف ہے!

پتہ نہیں یار لوگ کب تک باتیں کرتے رہے۔ لیکن میں سگریٹ بجھا کر میں نے آنکھیں بند کر لیں!

اور پھر ایک روشن مستقبل کی تلاش میں، انہیں روشن مستقبل کے تصور کو اپنے خیالوں میں بسائے جو بہ تہ نیند کے پرسکون سمندر میں دور دور تک بہت چلا گیا!

صبح روشن اور حرارت بخش تھی۔ میں جاگا نہیں بلکہ جگایا گیا۔ اور جب جاگا تو میں نے دیکھا کہ ہر متنفس بڑی پھرتی کے ساتھ تیاری میں مصروف ہے۔ حمام میں ایک ہجوم تھا۔ کسی کا ٹوتھ پیسٹ کسی کے ہاتھ میں اور کسی کا برش کسی کے ہاتھ میں۔ غرض کسی کو اپنی ملکیت کا احساس نہ تھا اور نہ کوئی اس تعلق سے توجہ دینے کے لئے تیار تھا۔ بلکہ سب ایک مشترکہ خاندان کے افراد کی طرح ایک دوسرے کی چیزیں بلا تکلف استعمال کر رہے تھے۔ البتہ ایک بات جو نمایاں نظر آ رہی تھی وہ یہ کہ ہر ڈیلی گیٹ اپنا سوٹ اور شرٹ منتخب کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور جس کا یہ مسئلہ حل ہو گیا تھا اس کی مشکل ٹائی کے انتخاب میں پیچیدگی پیدا کر رہی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آج کا دن عید کا دن ہے۔

www.taemeernews.com

تہوار کا دن ہے۔ جشن کا دن ہے۔ اور ہر ایک اپنے بہترین لباس میں باہر جانا چاہتا ہے۔ ہلکی ہلکی سینٹ کی بو چاروں اور پھیل رہی تھی!

دوسروں کو بتانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی نظر میں خود کو ایکٹیو ثابت کرنے کے لئے میں نے اپنے طور کوشش کی۔ لیکن تیار ہو کر جب میں سیڑھیوں سے نیچے اترا اور ناشتہ کے لئے ہال میں داخل ہوا تو ایک ساتھ کئی آوازیں اٹھیں۔

۔۔۔آیئے ۔۔۔ آیئے۔۔۔ آیئے ۔۔

اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے اس "آیئے" کے پیچھے کھڑا ہوا کوئی کہہ رہا ہے، کوئی بات نہیں۔ تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ تشریف لائیے۔ ناشتہ تیار ہے۔۔

ایک خفی مسکراہٹ کے ساتھ میں نے اس استقبال کا جواب دیا۔ اور میری نظریں اس لمبے میز کے اس سرے سے اس سرے تک بیٹھے ہوئے تمام مندوبین کے درمیان کسی خالی نشست کو ڈھونڈنے لگیں میز کی دوسری سمت مجھے ایک خالی سیٹ نظر آئی۔ ابھی میرے قدم اس طرف اٹھے ہی تھے کہ میرے دوست اظہر افسر نے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ اظہر کے قریب ہی ایک نشست خالی تھی۔ میں آگے بڑھ کر بیٹھ گیا۔

اظہر نے مسکرا کر بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا!

اظہر افسر کی یہ مسکراہٹ میں بیس سال سے نوٹ کر رہا ہوں۔ ادب کے میدان میں ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اظہر کا یہی مثبت رویّہ رہا ہے۔ کبھی بھی میں نے اسے اپنے فن کی اور اپنی بڑائی کی نمائش کرتے دیکھا اور نہ سُنا۔ اظہر حیدرآباد کی بجائے کسی اور صوبے کا ہوتا تو ملک کے نقاد ایک آواز میں اسے سراہتے۔ لیکن اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوا۔

www.taemeernews.com

میں نے کہا، بھئی تم اس طرح خاموش کیوں بیٹھے ہو، جب دوسرے ——— مجھے معلوم ہوا کہ اظہر بھی میری طرح لیٹ ہے۔ اور ابھی ابھی آیا ہے۔ دائیں طرف حیدرآباد کا ابھرتا ہوا نوجوان ادیب احمد جلیس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، جی میں بھی آپ کے ساتھ ہوں!

ناشتہ کے بعد چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم نے سگریٹ جلائی۔ اور والنٹیر کی اس اطلاع کے ساتھ ہی ہم چل کھڑے ہوئے کہ جلسہ گاہ میں ہمیں جلد پہنچ جانا چاہیئے۔

میں نے دیکھا برلا ہال اب صرف برلا ہال نہیں بلکہ نئی مسرتوں اور تبدیلیوں کا ایک سمبل بن گیا ہے۔ اور بمبئی سکڑ کر ایک آنکھ بن گئی ہے جو مستقبل کے کئی خوابوں کو اپنے اندر سمائے ہوئے بڑے شوق سے برلا ہال کو دیکھ رہی ہے۔ بمبئی ہی کیوں سارے ہندوستان کی نظریں آج برلا ہال پر ہیں۔ کیوں کہ سب ہی جانتے ہیں کہ ۲۹ ڈسمبر کی صبح برلا ہال میں ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔ اور اس کی روشنی ملک کے کونے کونے تک پہنچے گی!

اندھیرے میں رہنے والوں کو کب سے اس روشنی کا انتظار تھا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے؟

۲۹ ڈسمبر کے سورج کی دھوپ برلا ہال کے کمپونڈ میں پھیل چکی تھی۔ اسکوٹرس، موٹر سائیکلس، اور نئے نئے ماڈل کی موٹر کاریں۔ اس دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ درجنوں پولس کانسٹیبل اور افسر اپنے اپنے یونیفارم پر بلٹ اور بیاجوں کو چمکائے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اور ہر آنے والے پر کڑی نظر

www.taemeernews.com

رکھے ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ برلا ہال کے عقبی حصہ میں بھی پولیس کا معقول انتظام تھا۔ شاید اس لئے کہ تہذیبی جلسوں میں سماج دشمن عناصر کی طرف سے کسی نہ کسی گڑبڑ اور ہنگامے کا امکان رہتا ہے۔ اور یوں بھی وزیر اعظم کی آمد پر وزارت داخلہ کی طرف سے ہمیشہ ایسا ہی انتظام کروایا جاتا ہے۔

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو لیکن بڑی احتیاط سے ہر اس شخص کو اندر جانے کی اجازت دی جا رہی تھی جس کے پاس داخلے کا اجازت نامہ ہے منتظمین سے پوچھ تاچھ اس لئے نہیں ہو رہی تھی کہ ان کے بیاج ان کے اپنے سینوں پر امتیازی نشان بن کر چمک رہے تھے۔

پہلی تین چار صفیں مندوبین کے لئے مختص تھیں۔

ہم سب والنٹیروں کی رہنمائی میں برلا ہال میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

ہال میں تل دھرنے جگہ نہیں تھی۔ سارا ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر ایک نامعلوم خوشی کی چمک تھی۔ اور آنکھوں میں امید کی روشنی اور لبوں پر ——

اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد میں نے ہال کا جائزہ لیا اور میری نظریں ڈائیس پر رک کر رہ گئیں۔ شہ نشین کو ایک دلہن کی طرح سجایا گیا تھا بار بار دیکھنے کے بعد بھی سیر نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً شہ نشین کو سجانے والے آرٹسٹ نے کئی بار اپنے اس طریقہ عمل پر سوچا ہوگا۔ اس لئے تو شہ نشین کے پس منظر میں جو پردہ نیلے آسمان کی طرح پھیلا ہوا تھا سب کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس آسمان پر پندرہ ستارے روشن تھے۔ اور چمک چمک کر لوگوں کو جیسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ یہ پندرہ ستارے ہندوستان کی پندرہ دستوری

www.taemeernews.com

زبانوں کے سمبلس تھے۔ آپ جانتے ہیں ان میں ہر چمکنے والا تارہ کیا کہہ رہا تھا؟
میں بتاؤں۔ وہ کہہ رہا تھا اردو ، اردو ، اردو!!
اس پھیلے ہوئے نیلے آسمان پر بڑی خوبصورتی اور نفاست کے
ساتھ پندرہ زبانوں کی لپیٹوں میں اُردو لکھوا کر ٹانک دیا گیا تھا اور سارا ہال
جیسے اس آسمان کے نیچے سانس لے رہا تھا!
حاضرین جلسہ آرٹسٹ کی اپنی خاموش زبان میں تعریف کر رہے تھے۔
میں بھی ان سے ایک تھا!
سب اپنی اپنی جگہ وزیر اعظم کی آمد کے منتظر تھے مقررہ وقت
گذرنے کے بعد یوں لگتا تھا جیسے وزیر اعظم اب آئیں اور اب آئیں۔
آخر کار وہ لمحہ آیا۔
وزیر اعظم آ رہی ہیں!
وزیر اعظم آ رہی ہیں!!
ایک خبر ہوا کے تیز جھونکے کی طرح ہال میں داخل ہوئی اور حاضرین
نے دیکھا کہ وزیر اعظم چاکلیٹی رنگ کی قیمتی ساڑی میں بلبوس اپنے مخصوص انداز
میں پلو کو بار بار ٹھیک کرتی ہوئیں تیز تیز قدموں سے ہال میں داخل ہو رہی ہیں۔
ساتھ ہی ایک درجن کے قریب فوٹو گرافروں کے کیمروں کی روشنیاں ایک
ساتھ چمک کر آف ہو گئیں۔
حاضرین جلسہ نے اٹھ کر وزیر اعظم کا استقبال کیا!
وزیر اعظم بیس منٹ دیر سے ہال پہنچیں۔ وزیر اعظم کے ساتھ
فخر الدین علی احمد، مرکزی وزیر صنعت، جی یم صادق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر
اے۔ کے گجرال، مرکزی وزیر اطلاعات، یونس سلیم وزیر اور دوسرے

www.taemeernews.com

کئی حضرات تھے۔

شہ نشین پر پہنچ کر کرسی پر بیٹھنے کے بعد وزیر اعظم نے سامنے کی صفوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ پھر مسکرا کر ان خواتین کی طرف دیکھنے لگیں جن کی شخصیت میک اپ کے پیچھے کہیں چھپ گئی تھی۔

وزیر اعظم کے ساتھ بیٹھنے والوں میں ملک کے پندرہ زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ کئی ریاستی اور مرکزی وزرا بھی تھے۔ لیکن انھیں اس ترتیب سے بٹھایا گیا تھا جیسے کسی خاندان کے فوٹو گروپ میں بڑی اور اہم شخصیتوں کو سامنے اور غیر اہم کو پیچھے بٹھایا جاتا ہے۔ سب سجے سجائے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی راجا یا بادشاہ کے دربار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

باادب باملاحظہ ہوشیار۔

اُردو کمیٹی کے نوجوان سکریٹری سید محمد زیدی جو بلو سوٹ میں ملبوس تھے مسکراتے ہوئے مائیک کے سامنے آئے۔ اور انہوں نے کچھ ان الفاظ میں مخاطب کیا۔ محترمہ وزیر اعظم صاحبہ۔ آپ کی تشریف آوری ہم سب کے لئے انتہائی خوشی اور فخر کی بات ہے۔ ہم بے چینی سے آپ کے منتظر تھے صبح صبح آپ کے استقبال کی تیاریوں کے سلسلے میں جب میں اپنے گھر سے نکل رہا تھا تو میرے لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اپنے لڑکے کو مختصراً بات بتا دی۔ اور آپ کی آمد کی اطلاع دی۔ میرے لڑکے نے مجھ سے پوچھا، کیا اندرا گاندھی مجھے اسکول میں اردو پڑھنے کی اجازت دینگی؟

میں نے کہا میں نہیں جانتا۔!

پھر زیدی نے بڑی شستہ اور صاف اُردو میں اپنے اسی لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا، اندرا جی! اس وقت میرا لڑکا میرے ساتھ ہے میں

www.taemeernews.com

اسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ معصوم بڑی عقیدت سے پھولوں کے ہار لئے آپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آپ براہ کرم اس کے پیش کئے ہوئے پھولوں کے اس تحفہ کو قبول کیجئے اور میرے لڑکے کو دعا دیجئے!

ساتھ ہی حاضرین نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکا اپنے باپ کی طرح بلو سوٹ میں ملبوس اپنے ننھے ہاتھوں میں بہت ہی بڑا پھولوں کا ہار لئے وزیر اعظم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس بچہ کو دیکھ کر وزیر اعظم اٹھ کھڑی ہوئیں اور بڑے پیار سے اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے ہار کو پہن لیا۔ اور سارا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا اور پھر ایک ساتھ ہی کئی فوٹو گرافروں کے کیمروں کی روشنیاں بجلی کی طرح چمک کر غائب ہو گئیں۔

یہ فوٹو گرافر کتنے چست اور چالاک ہیں وہ ہر اچھے اور خوبصورت لمحے کو اپنے کیمرے میں مقید کر لیتے ہیں۔ کیا ابھی ابھی وزیر اعظم کی لی گئی تصویر میں وہ رنگ بھی ابھرے گا جس سے ممتا عبارت ہے!

میں نے سوچا یقیناً ابھرے گا۔ کیمرہ بڑا حساس ہوتا ہے۔ فوٹو گرافر بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ یقیناً انہوں نے میری طرح، سب کی طرح وزیر اعظم کے چہرے پر ممتا کے اس جذبے کو دیکھا ہوگا۔ جب وہ پھولوں کا ہار پہن رہی تھیں اس لمحہ وہ وزیر اعظم نہیں تھیں صرف اندرا گاندھی تھیں، ایک عورت تھیں۔ ایک ماں تھیں اپنے بچوں کی۔ وہ لمحہ عورت کی زندگی میں بڑا خوشی کا لمحہ ہوتا ہے جب ممتا کا سمندر جوش مارنے لگتا ہے اور ماں کے ہاتھ اپنے بچے کے پھول جیسے گالوں کو تھپتھپانے لگتے ہیں۔ واقعی ان فوٹو گرافروں کا جواب نہیں۔ زیدی کا جواب نہیں۔ وہ جتنے اچھے خطوط لکھتے ہیں اتنا اچھا بولتے بھی ہیں

www.taemeernews.com

زیدی نے اپنے چند فقروں پر مشتمل مختصر سی تقریر میں کتنی بڑی بات کہی ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

زیدی نے اپنے لڑکے کا کیا ذکر کیا، مجھے اپنی لڑکی یاد آگئی۔ میری لڑکی جو اپنی ماں یعنی میری بیوی کے ساتھ شہر حیدرآباد سے اسی میل دور رہتی ہے اور جس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں خط لکھتے ہوئے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اس کے اسکول کی ہیڈ مسٹرس کے نام اندرا گاندھی سے ایک سفارشی خط حاصل کروں کہ وہ اسے اردو پڑھنے کی اجازت دیدے۔

میری بچی کتنی معصوم ہے۔ زیدی کا بچہ کتنا پیارا ہے۔ فوٹوگرافر کتنے تیز ہیں۔ آج کا دن کتنا مبارک ہے۔ سنو ـــــ سنو ـــــ

ڈاکٹر ملک راج آنند کا نام پکارا جارہا ہے۔

انگریزی زبان کے مشہور ادیب اور صدر استقبالیہ کمیٹی ڈاکٹر ملک راج آنند کھادی کے نہرو شرٹ اور پائجامہ میں ملبوس مائیک پر تشریف لائے اور اپنے مخصوص لب و لہجہ میں انگریزی میں لکھا ہوا خطبۂ استقبالیہ پڑھنے لگے۔

آپ نے وزیر اعظم کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "آپ ایک عظیم باپ کی بیٹی ہی نہیں بلکہ ایک عظیم ملک کی وزیر اعظم بھی ہیں۔ ابھی پچھلے چند مہینوں میں آپ نے عوامی بھلائی کے لئے جو جرأت مندانہ اقدامات کئے ہیں وہ ہمارے ملک کی جمہوری تاریخ میں اپنی آپ مثال ہیں اور ساتھ ساتھ ڈیموکریٹک سوشلزم کے لئے ایک نئی راہ بھی۔ آخر میں ڈاکٹر ملک راج آنند

www.taemeernews.com

نے کہا، آنرایبل پرائمنسٹر! آپ کی لیڈرشپ میں ملک جس سماجی انقلاب سے دوچار ہے مجھے یقین ہے کہ اس میں ناانصافیوں کی تلافی کی جائیگی اور زبان اردو کو اس کا اپنا جائز مقام دیا جائے گا۔ ایوان نے ایک ساتھ تالیاں بجاکر گویا اس خیال کی تائید کی!

اس کے بعد ممتاز ادیب کرشن چندر مسکراتے ہوئے مائیک پر آئے اور ذرا جھک کر وزیراعظم سے جیسے اپنا مضمون پڑھنے کی اجازت چاہی اور پھر ان الفاظ میں مضمون شروع کیا۔

پردھان منتری جی، معزز مہمانوں اور دوستو!

"آج کی عدالت میں اردو کا مقدمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ عدالت کسی ہائیکورٹ یا سپریم کورٹ کی عدالت نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے دل، ضمیر اور روح کی عدالت ہے جس کے سامنے ایک بے بس اور مظلوم زبان اپنے لئے اپنی زندگی اور اس کی حفاظت کا حق مانگنے آئی ہے۔

اور یہ حق اس کو ملنا چاہیے کیونکہ اردو کہتی ہے میں اس ملک کی زبان ہوں۔ میں دہلی اور لکھنؤ کے قرب وجوار میں پیدا ہوئی۔ میری دلکشی اور آپ کی محبت نے مجھے بڑھاوا دیا۔ اور میں دھیرے دھیرے شمالی ہند میں پھیل گئی۔ مجھے یو۔پی، بہار، دہلی، ہریانہ، راجستھان میں کروڑوں لوگ بولتے ہیں اور

www.taemeernews.com

سمجھتے ہیں۔ یہی میرا وطن ہے۔ یہی میرا گھر ہے۔ اس مٹی کی بو باس میرے انگ انگ میں رچی ہوئی ہے۔ میں اس دیش کے کروڑوں لوگوں کا مزاج ہوں۔ مجھے میرا گھر دے دیجئے۔ مجھے میرا وطن واپس ملنا چاہیئے۔"

اس فقرہ کو جب کرشن چندر نے پورا کیا تو ہال تالیوں کی آواز سے گونج گونج اٹھا۔

وزیر اعظم بڑی توجہ سے کرشن کے مضمون کو سن رہی تھیں۔

تالیوں کی گونج جب کم ہوئی تو کرشن نے اپنی گونجیلی آواز میں پھر مضمون پڑھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ہال میں سناٹا چھا گیا۔

کرشن کی آواز سارے ہال میں پھیل رہی تھی ——

"اردو زبان کہتی ہے کہ میں کسی ایک فرقے کی زبان نہیں ہوں کچھ COMMUNAL لوگ، کچھ کم نظر لوگ مجھے صرف مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ حالانکہ اگر ایسا ہی ہوتا تو بھی کوئی بُرا نہ ہوتا۔ کیا اس دیش میں مسلمانوں کو اپنے دھرم، اپنے کلچر، اپنی شخصیت، اپنے مزاج اور اپنی زبان کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں ہے؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے ہر شخص کے دل کو پکڑ لیا۔ جواب میں بڑی دیر تک تالیاں بجتی رہیں!

پھر اردو نے اپنی کہانی سناتے ہوئے خود ہی جواب دیا ——

"لیکن میں تو نہیں کہتی اتہاس کے ورق الٹ جایئے۔ میں اپنی زندگی کے کسی حصے میں کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں رہی ہوں۔ مجھے اگر کروڑوں مسلمان

www.taemeernews.com

بولتے ہیں تو کروڑوں ہندو، سکھ اور عیسائی بھی بولتے ہیں
میں نے قرآن کے ساتھ ساتھ وید اور گیتا کو بھی اپنے سینے سے
لگایا ہے۔ جپ جی صاحب کا پوترپاٹھ اور مقدس بائبل کے
اقوال میری روح میں رچ بس گئے ہیں۔ میری زبان میں اور میری
لپی میں آریہ سماجیوں کے اخبار نکلتے ہیں۔ سناتن دھرمیوں
کے اخبار نکلتے ہیں۔ جین سنگھیوں کے اخبار نکلتے ہیں۔ اکالیوں
کے اخبار چھاپے جاتے ہیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت
ہوتے ہیں۔ میرے چاہنے والوں میں اگر میرامن غالب تھے
تو چکبست، رتن ناتھ سرشار، پریم چند اور دیا شنکر نسیم
بھی تھے۔ اور آج بھی میرے لکھنے اور پڑھنے والوں میں ....."

پھر اردو نے اپنے بیان کے ثبوت میں وزیر اعظم کی خدمت میں اور ایوان کے سامنے ایک لمبی فہرست پیش کی جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں مسلم ادیبوں اور شاعروں کے نام تھے، اور دوسرے حصے میں ہندو، سکھ اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے نام تھے اور یہ سب تھے ایک ہی زبان کے فن کار۔ آج کے فن کار ——

اردو کے وکیل کرشن چندر نے اردو کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے بڑے واضح انداز میں خود اردو کی زبانی اس الزام کو رد کر دیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ "اگر اردو مسلمانوں کی زبان ہوتی تو پھر درجنوں غیر مسلم ادیب اور شاعر اردو زبان میں کیسے پیدا ہو گئے؟"

ہال کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بھلا اس زندہ اور عالمگیر سچائی کو

www.taemeernews.com

کون جھٹلا سکتا ہے ؟

اس کے بعد اردو نے اپنے دل اور اپنی ممتا کے سارے پیار کو ایک ہی لفظ میں سموتے ہوئے کہا ــــ

"میں وہ ماں ہوں جس نے اپنی گود میں ہر مذہب اور ہر دھرم کے بچّوں کو پناہ دی ہے۔"

اور پھر پلٹ کر اس نے وزیر اعظم سے پوچھا ــــ

"کیا اسی لئے میری گردن ماری جائے گی ؟ کیا ماں کی محبت کا یہی انعام ہوتا ہے ؟"

میں نے دیکھا وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی جیسے کسی اندرونی کرب سے بے چین ہو گئی ہیں۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر کئی رنگ آ جا رہے تھے۔ کیونکہ ان کے سینہ میں بھی ماں کا دل تھا۔ اور وہ سمجھ سکتی تھیں کہ ماں اپنے بچّوں کے لئے، سماج کے لئے ایک بہتر اور روشن مستقبل کے لئے کتنی عظیم ہوتی ہے۔ اور اس کی عظمت کا یہ انعام نہیں ہوتا جس کا اظہار ابھی ابھی اردو نے اپنی بے بسی کی کہانی سناتے ہوئے کیا تھا ــــ

اردو نے پھر اپنے لب و لہجہ کو بدلتے ہوئے ارباب اقتدار کو بتایا۔

"میں ایک ہندوستان گیر اور جہاں گیر زبان ہوں۔ ایک عالم میں میری دلکشی، حلاوت اور حسنِ ادا کے چرچے ہیں میں صرف دہلی، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، ہریانہ اور راجستھان میں ہی بولی یا سمجھی نہیں جاتی، مجھے اہل پنجاب اور اہل کشمیر نے بھی اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ ٹیگور کے وطن کی راجدھانی

www.taemeernews.com

کلکتہ میں میرے درجنوں اخبار نکلتے ہیں۔ شری نائیک جس
پرانت کے مکھیہ منتری ہیں اس کے سب سے بڑے شہر
بمبئی میں بھی اُردو کے بہت سے اخبار نکلتے ہیں۔ اور ہر روز
کسی نہ کسی محفل میں میرے گیت گنگنائے جاتے ہیں میرے
اخبار اور رسالے بنگلور سے بھی شائع ہوتے ہیں اور مدراس
اور اڑیسہ میں بھی مجھے سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ میں وہ زبان ہوں
جو اپنے وطن ہند کے علاوہ دکن کے کروڑوں لوگوں کی جان
ہوں۔ میں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہوں۔ اور میں
نے اپنے دل کا پیار اپنی نگاہ کی نرمی اور اپنی روح کی حلاوت
مختلف صوبوں میں رہنے والے مختلف قومیتوں کے لوگوں کو
دی ہے۔ کیا اس لئے میرا منہ بند کیا جا رہا ہے؟"

ایک تانیئے کے وقفہ کے بعد اردو نے عوامی عدالت میں اپنے بیان کو
پھر اس طرح جاری رکھا ـــــــ

"میں وہ زبان ہوں جس نے اس دھرتی پر جنم لیا۔ میں بھی ہندی
بنگالی، گجراتی، مراٹھی، ٹمل، ملیالم، اوڑیہ، آسامی، سندھی،
تلگو، کنڑا اور دوسری بھاشا کی طرح بھارت ماتا کی بیٹی ہوں۔
یہی میرا دیش ہے۔ یہیں میں پلی، بڑھی اور سارے ہندستان
میں پھیل گئی۔ اور اب تو مجھے دوسرے دیشوں میں بھی پہچانا
ملی ہے۔ پاکستان والوں نے بنگالی اور پنجابی، سندھی اور
بلوچی اور پشتو کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اپنایا ہے۔ میں ملیشیا

www.taemeernews.com

میں بولی اور سمجھی جاتی ہوں۔ اور ایسٹ آفریقہ میں بھی۔ لندن میں میرے تین اخبار نکلتے ہیں اور کئی رسالے۔ میں ہندوستان اور دوسرے دیشوں کے درمیان سمجھنے سمجھانے کے لئے ایک پل کا کام کرتی ہوں۔ کیا اس لئے مجھے ڈائنا میٹ سے اڑا دیا جائے گا؟"

سوال ـــــ سوال ـــــ سوال!!

اپنی دکھ بھری کہانی سناتے ہوئے اردو نے اب تک کئی سوال پوچھے تھے۔ لیکن اس کا جواب دینے والا کون تھا؟

سب سکتے کے عالم میں تھے!

اور یوں لگتا تھا جیسے اردو ابھی کچھ کہنا چاہتی ہے۔ کہانی کا کلائمکس قریب آرہا تھا۔

اُردو کہہ رہی تھی ـــــ

"میں ایک سکیولر زبان ہوں۔ میں روزی روٹی کے لئے جدوجہد کرنے والے کروڑوں کی تعداد میں کام کرنے والے لوگوں کی زبان ہوں۔ میں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے ہر موڑ پر حصہ لیا ہے۔ میں نے ہندوستانی سماج کو بدلنے اور اسے آگے بڑھانے کی ہر لڑائی میں اپنی محنت، اپنا فن اور اپنے شاعروں اور ادیبوں کا لہو پیش کیا ہے۔ اور اگر یہی میرا جرم ہے تو میں اپنے جرم پر فخر کرتی ہوں۔ اور مجھے اس بات کا غرور ہے کہ ہر لڑائی میں، میں نے ہندوستانی

www.taemeernews.com

جنتا کو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دیا ہے۔"

اپنے اس مقدس جرم کے اعتراف کے بعد اُردو نے اپنے اسی لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا ——

"آج پھر ہم ایک انقلابی موڑ پر کھڑے ہیں۔ اور ہمارے دیش کی پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی اس نئے انقلابی موڑ کا نشان بن گئی ہیں۔ اور ہماری آشاؤں اور امیدوں کا مرکز پچھلے سماج نے اردو سے انصاف نہیں کیا۔ کیونکہ اس نے اس دیش کی جنتا سے بھی انصاف نہیں کیا۔"

لیکن اب ——— اب ———!!

ہندوستان کی جنتا باشعور ہوگئی ہے۔ ملک ایک انقلابی موڑ پر آگیا ہے۔ سارے بنک قومی ملکیت بن گئے ہیں، راجا، رجواڑے شہزادے اور نوابوں کی جیب خاص منسوخ کی جا رہی ہے۔ کل ہی شام کو دس لاکھ کے عظیم اجتماع میں ہماری وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ ہم اُردو کو وہی مقام دینا چاہتے ہیں جو ملک کی دوسری زبانوں کو حاصل ہے ——— انقلاب زندہ باد ——— اُردو زندہ باد!! ———

اُردو نے بڑے پُر امید لہجے میں اپنی کہانی ختم کی۔ اور اس یقین کا اظہار کیا کہ آنے والا ڈیموکریٹک سوشلزم کا دور اس سے انصاف کریگا!

ویسے کہانی اُردو کی سچی تھی۔ اور اُردو کی زبانی سنائی گئی۔ لیکن اردو کے مقدمے کو کرشن چندر نے جس حقیقت پسندانہ تکنک اور خلوص سے ضمیر اور روح کی عدالت میں پیش کیا وہ ہر اُردو بولنے والے کے

www.taemeernews.com

دل کی آواز تھی۔

کرشن کے جاتے ہی مہاراشٹرا کے وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا
مائیک پر آئے۔

اُردو کمیٹی کی طرف سے غالب صد سالہ برسی کے موقع پر شائع کردہ دیوان غالب کا مرصع نسخہ وزیراعظم کو پیش کرتے ہوئے زکریا صاحب نے کہا، وزیراعظم صاحبہ۔ کل کے تاریخی جلسہ عام میں آپ نے جن احساسات اور جذبات کا اظہار اُردو زبان کے تعلق سے کیا ہے انھیں ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کے والد نے جہاں ہندوستان کے کھنڈرات میں سے "ڈسکوری آف انڈیا" کو برآمد کیا وہیں مرزا غالب بھی بھی ہمارا ایک ایسا قومی ورثہ ہے جس کی ضرورت ہمیں زندگی کے ہر سفر میں پیش آئے گی!

اندرا جی! آپ کے آہنی ارادوں کی بدولت جہاں ملک کا مقدر بدل رہا ہے وہاں غالب کی تشبیہات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اب ہندوستان اپنا کاغذی پیرہن اُتار کر ایک نقشِ فریادی بن گیا ہے۔ نئے، طاقت ور اور ابھرتے ہوئے سماج کی تعمیر میں جہاں آپ کا دل نمایاں ہے، وہاں اردو بھی آپ کے نظرِ کرم سے محروم نہ رہے۔

اب میں دیوان غالب کا یہ نیا ایڈیشن آپ کی خدمت میں غالب کے ایک مقبول شعر کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

www.taemeernews.com

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس شعر پر بڑی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اور میں نے دیکھا، وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی واقعی شرما رہی ہیں!

تالیوں کا شور جب ختم ہوا تو سب نے دیکھا پیرانہ سال اُردو کے مشہور شاعر، ریٹائرڈ جج اور پارلیمنٹ کے ممبر جناب آنند نرائن ملّا۔ قیمتی شیروانی اور چوڑی دار پائجامے میں ملبوس اپنی نشست سے اٹھ کر آہستہ آہستہ مائیک کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

حاضرین جلسہ میں سے ہر ایک نے یہی سوچا کہ ملّا صاحب رسمی مخاطبت کے بعد اپنی اس یادداشت کو پڑھیں گے جس کے تعلق سے اکبر پیر بھائی ہال میں گئی شام قطعی تصفیہ ہو چکا تھا۔ لیکن توقع کے خلاف ملّا صاحب نے کہا، "آنریبل پرائم منسٹر صاحبہ! مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں آپ کی خدمت میں کوئی میمورنڈم اُردو کے بارے میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ گئی رات ہم سب ایک نتیجے پر پہنچے۔ اور اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم کسی ٹائپسٹ کی خدمات حاصل کر کے میمورنڈم کو ٹائپ کرواتے۔ لہذا آنریبل پرائمنسٹر صاحبہ، میں اس میمورنڈم کو ٹائپ کروا کر کسی قریبی تاریخ میں آپ تک پہنچا دوں گا۔"

ملّا صاحب جب یہ تقریر فرما رہے تھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُردو والے کسی کام کے اہل نہیں۔ حد ہو گئی۔ بمبئی جیسے

www.taemeernews.com

شہر میں انہیں ایک ٹائپسٹ نہیں ملا۔!

ملا صاحب کی اس تقریر کا ردِ عمل عام طور پر کیا ہوا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن وزیر اعظم بڑی حیرت سے اپنی پلکوں کو بار بار جھپکاتی ہوئی انھیں دیکھ رہی تھیں کہ آخر وہ کیا کر رہے ہیں!

اور پھر جب ٹائپسٹ کی بات آئی تو وہ یکدم مسکرا پڑیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں، ملا صاحب، پھر آپ حضرات نے مجھے کیوں بلایا؟ اور جب آپ خود نہیں جانتے کہ کیا کہنا ہے تو پھر اس کنونشن کو بلانے کی آپ نے زحمت کیوں گوارا کی؟

پھر جناب آنند نرائن ملا نے براہ راست ایوان سے مخاطب ہو کر کہا، میں اُردو والوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اُردو کا جھگڑا سڑکوں پر نہیں بلکہ میز پر حل کریں۔

ایک لمحہ کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُردو کے مشہور شاعر آنند نرائن ملا کسی اور شخصیت کا نام ہے اور سامنے ٹائپس پر مائیک کے پاس جو صاحب کھڑے ہیں وہ کوئی اور ہیں۔ اگر یہ غلط ہے اور واقعی یہ وہی ملا ہیں تو غالب نے شاید ان ہی کے لئے یہ بات کہی تھی ــــ

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

ہو سکتا ہے کہ ملا صاحب کے تعلق سے یہ میرا ذاتی احساس ہو۔ اور ایوان میں سے کسی نے ایسی بات نہ سوچی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میرا یہ احساس ایک مشترکہ احساس ہو۔ جس میں سب برابر کے شریک تھے اور

www.taemeernews.com

. صرف یہ بات مان لی بھی جائے کہ یہ سب غلط باتیں ہیں تو یہ بات قطعی تھی کہ ملا صاحب ناراض ہیں۔ کل کے ہنگاموں کا نفسیاتی ردعمل۔

انہوں نے کہا ' ایک بار میں پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو اردو کا جھگڑا سڑکوں اور میدانوں میں حل کرنا چاہتے ہیں وہ اردو کو فائدہ نہیں نقصان پہنچائیں گے۔ اردو والے غیر فرقہ وارانہ خطوط پر ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دے کر اردو کو اس کا اپنا جائز حق دلا سکتے ہیں۔

اپنے لہجہ کو بدل کر ملا صاحب نے وزیر اعظم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ محترمہ وزیر اعظم صاحبہ، فی الوقت میں آپ کی خدمت میں میمورینڈم کا وہ خلاصہ پیش کرتا ہوں جس پر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیبوں کے دستخط ہیں۔ انہوں نے کہا۔ اردو زبان کو دہلی، یوپی، بہار، ہماچل پردیش اور ہریانہ میں علاقائی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اور اس کی حیثیت کو قانوناً نافذ کیا جائے۔

ملا صاحب کی ساری تقریر میں ایک بات جو نوٹ کرنے کے قابل تھی وہ یہ کہ انہوں نے وسیع تر سیاسی مسئلہ کے ایک جز کی حیثیت سے اردو کو پیش کیا۔

جناب ملا کی تقریر کے فوری بعد اردو کی حمایت میں ایک میمورینڈم وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ہری کرشن مہتاب اس کی تائید کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

www.taemeernews.com

اُردو کے مطالبے کی بھرپور تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر مہتاب نے کہا' صرف زبانی ہمدردی اور خوش آئند وعدوں سے کام نہیں چلے گا۔ ضرورت ہے کہ ان ہمدردیوں اور وعدوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے انڈین کانسٹی ٹیوشن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ دستور بنانے والوں نے اردو کو اس کا اپنا مستحقہ مقام دیا تھا۔ لیکن بعد میں عملاً اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ ایک اُردو ہی نہیں بلکہ ملک میں بولی جانے والی دوسری چھوٹی چھوٹی زبانوں کے ساتھ بھی ناانصافی کی گئی ہے۔ آخر میں انہوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر کہا' اُردو اس ملک کے کروڑوں باشندوں کے بولنے اور سمجھنے کی زبان ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ اس کی حیثیت کو تسلیم کرلے۔

پھر ایک بار ہال تالیوں کی گونج سے جیسے دہل گیا!

وزیراعظم نے اپنے پلّو کو ٹھیک کیا اور تقریر کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور ہال میں بیٹھے ہوئے ایک ایک فرد کی نظر وزیراعظم پر جم کر رہ گئی۔ اور سب کے دل مسرت، خوشی اور سہانی امید کے ملے جلے جذبے سے اچھلنے لگے۔ شاید وہ لمحہ آگیا۔ وہ لمحہ جس کا زیدی کے لڑکے کو میری لڑکی کو اور ملک کے سینکڑوں لڑکوں، لڑکیوں اور نئی نسل کو انتظار ہے۔ وہ لمحہ ——— لیکن یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ اردو کا جھگڑا سڑکوں پر نہیں میز پر حل کیا جائے سڑکوں پر نہیں میز پر ——— سڑک ——— میز ——— جھگڑا ———

آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے!

کچھ بھی تو نہیں۔ یہ آواز تو ملا صاحب کی آواز تھی جنہیں تقریر کئے بہت وقت ہو چکا۔ دیکھو وہ اپنی نشست پر ہیں۔ یہ تو وزیراعظم کی آواز ہے۔

www.taemeernews.com

سنو سنو! وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

وزیر اعظم نے بہت ہی محتاط انداز میں اپنی تقریر کا آغاز کچھ اس طرح سے کیا "مجھے افسوس ہے کہ میں نے اردو نہیں پڑھی۔ ویسے میں نے اردو سیکھنے کی کوشش کی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں جیل میں تھی لیکن میری جو استاد تھیں وہ مجھ سے کچھ زیادہ اردو نہیں جانتی تھیں۔ اور خود میرے ساتھی قیدیوں کا کہنا تھا کہ ہم اپنے اپنے گھروں کو ان سے خط تو لکھواتے ہیں لیکن جواب نہیں آتا۔ پھر اس کے بعد باوجود اپنی خواہش کے مجھے اردو سیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

اس دلچسپ انکشاف پر ہال میں قہقہے پھوٹ پڑے۔ اور ایوان کی سنجیدہ فضا جیسے ایک لمحے کے لئے ہلکی پھلکی ہوگئی اور لوگ تازہ دم ہو گئے۔

قہقہوں کی آواز کم ہونے کے بعد جہاں ایوان پر پہلی سی سنجیدگی چھا گئی وہیں وزیر اعظم کے چہرے پر بھی۔

اب کام کی بات ہوگی۔ ایوان نے سوچا۔ وزیر اعظم نے اب تک جو تقریر فرمائی وہ تو ایک تمہید تھی۔ اصل تقریر تو اب شروع ہونے والی ہے۔ وزیر اعظم نے کچھ سوچتے ہوئے حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالی اور کہا "اردو کے مسئلے کی جو اہمیت ہے اسے میں جانتی ہوں۔ مجھے یہ بتانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ ویسے ہم نے اپنے طور پر اس زبان کو اس کا جائز حق دلانے کی پوری کوشش لیکن ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اردو کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اردو کی راہ

www.taemeernews.com

ہیں جو مشکلیں اور کٹھنائیاں ہیں اس سے آپ بھی واقف ہیں اور میں بھی۔ میں جانتی ہوں۔ اس لئے میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ میں اس وعدے کو پورا کر سکوں گی۔ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اس سلسلے میں ——

وزیر اعظم جب اس فقرے پر پہنچیں تو ایوان جیسے چونک اٹھا کیونکہ یہ بات انہوں نے انفرادی اور ذاتی حیثیت میں نہیں کہی تھی۔ بلکہ ہندوستان کی وزیر اعظم کی حیثیت میں کہی تھی۔ آخر وہ کون سی قوتیں ہیں جنہوں نے دنیا کی بڑی پارلیمانی جمہوریت کے لیڈر کے ہاتھوں کو باندھ دیا ہے؟

اگر یہ بات صحیح ہے تو وہ کون سی قوت تھی جس نے کل دس لاکھ کے اجتماع کے سامنے وزیر اعظم سے یہ بات کہلوائی تھی کہ ہم اردو کو وہی مقام دینا چاہتے ہیں جو ملک کی دوسری دستوری زبانوں کو حاصل ہے۔

وزیر اعظم کی آواز برلا ہال میں گونج رہی تھی۔

اور پریس کے نامہ نگار بڑی تیزی سے ان کی تقریر نوٹ کرتے جا رہے تھے۔

وزیر اعظم نے آہستہ آہستہ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا' اگر اردو کے لئے کچھ کیا جائے تو ڈر ہے کہ اس کا نتیجہ کہیں ایسا خوفناک نہ نکل آئے کہ آپ کو اسکولوں میں اردو پڑھنا بھی مشکل ہو جائے۔

ایک ثانیے کے لئے وزیر اعظم رک گئیں۔ اور پھر حاضرین جلسہ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا، بہر حال یہ ماحول ہے جو ہمیں ملا ہے اور ہمیں اس ماحول کو بدلنا ہے۔ ایک وسیع تر کشمکش ہے جس کا آغاز ہو چکا ہے جسم نہیں جانتے کہ ہم اس میں کامیاب ہوں گے یا نہیں۔ اُردو کے لئے ایک منظم ہمہ گیر

www.taemeernews.com

اور مسلسل جد وجہد کی ضرورت ہے۔ یہ صرف ایک کنونشن ایسا ہوا ہے۔ ایسے کنونشن ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہونے چاہئیں۔ ادیبوں اور شاعروں کے دستخط کافی نہیں ہیں۔ ایک عوامی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی طرف سے مانگ اٹھے تب کچھ بات بنے۔ اس طرح سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کو مبارک باد دیتی ہوں۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اس نے ہندوستان کی تہذیب کو مالا مال کیا ہے۔ یہ ایک خوبصورت زبان ہے اور ہمارا مشترکہ ورثہ ہے۔ ایسی خوب صورت چیز کو ہم کیوں کھوئیں؟

لیکن ——————

"لیکن" کے ساتھ ہی وزیر اعظم ایک لمحے کے لئے رک گئیں۔ اور پھر غیر محسوس طور پر انہوں نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا، لیکن جو ذہنیت پیدا ہو گئی ہے اس کا بدلنا مشکل ہے۔ ہمارے ریڈیو کی جو زبان ہے وہ عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ خود ہم بھی نہیں سمجھتے۔ اب میں گجرال جی کو کیا کہوں۔ جب میں وزارت میں تھی تو نے اتنی کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

اس کے بعد وزیر اعظم نے کہا ' اردو کو ہم نے تین زبانوں والے فارمولے میں بھی شامل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا تسلی بخش نتیجہ نہیں نکلا اس کے لئے ابھی بعض پردیشوں سے مشورہ کرنا ہے۔ بات کرنی ہے۔

آخر میں وزیر اعظم نے مشورہ دیا کہ قومی سطح پر اردو تحریک کو

آگے بڑھایا جائے —————— عوام کی طرف سے ——————

وزیر اعظم کی تقریر ختم ہوتے ہی سارے ماحول پر ایک آسیبی سناٹا چھا گیا!

www.taemeernews.com

ظاہر ہے یہ ایک نفسیاتی ردعمل تھا۔ بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ پچاس کروڑ افسانوں کی وزیر اعظم کی زبان سے ایسے الفاظ سننے پڑیں گے۔ جن میں مایوسی تھی احساس شکست خوردگی تھا۔ اور ساتھ ہی ماضی کے ان بڑھتے ہوئے اندھیروں کا ذکر تھا جو ابھی تک پیچھا کر رہے تھے۔ سارا جوش اور ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ امید ایک ذبح شدہ مرغی کی طرح پھڑپھڑا کر خاموش ہو گئی۔ اور صحرائے حقیقت کے نکیلے خار پھر جسم اور روح پر چبھنے لگے۔ اس سے پہلے بھی اس چبھن کو محسوس کیا گیا۔ بار بار محسوس کیا گیا۔ یہ کوئی نئی چبھن نہیں ہے۔ یہ چبھن ہمارا مقدر بن گئی ہے اور اسی مقدر کو لے کر نئی نسل نے اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ لیکن ہم اس چبھن کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ اور ہم نے کئی بار بھلانے کی کوشش بھی کی۔ اس بار بھی ہم سے یہ بھول سرزد ہوئی۔ ہم نے اپنی دانست میں یہ فرض کر لیا، نہیں یہ سمجھ لیا کہ ہمارے درد کا بھی مداوا ہے۔ شاید کوئی مسیح ہمیں زندگی کی روشنی عطا کرے۔ سوچا تھا کہ طلوع ہوتی ہوئی صبح کے ساتھ ہی اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ اور ہمارے تنگ و تاریک گھروں میں بھی اجالا ہوگا۔ بہار آئے گی تو کسی ایک کے لئے نہیں سب کے لئے آئے گی۔ اور گھر گھر خوشیاں تقسیم کرے گی۔ لیکن ——

لیکن آج ہمیں پتہ چلا کہ ہم زمین پر نہیں تھے۔ آسمان پر تھے۔ خیالوں کی دنیا اور خوابوں کی وادی میں سانس لے رہے تھے۔ شکر ہے کہ آج پھر ہم زمین پر آ گئے۔ ہمیں زمین پر لائے گئے۔ اور اس کیلئے

www.taemeernews.com

ہمیں اپنی وزیراعظم کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے ہمیں خواب غفلت سے جگایا۔ اور بتایا کہ ہمارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ اشاروں اشاروں ہی میں انہوں نے کہہ دیا کہ اگر اردو کے لئے کچھ کیا جائے تو ڈر ہے کہ اس کا نتیجہ کہیں ایسا خوفناک نہ نکل آئے کہ ــــــ

اس لفظ "کہ" میں سب کچھ تھا۔ سوچنے والے سوچیں اور سمجھیں۔ دوسرے الفاظ میں وزیراعظم نے جیسے یہ کہہ دیا کہ اگر میں آپ کے مطالبے کو مان لوں تو ملک کے مختلف حصوں میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائیگا فسادات کی آگ ہر طرف بھڑک اٹھے گی۔ پھر قتل ــــــ خون ــــــ غارتگری ــــــ لوٹ ــــــ رانچی میں بھی تو یہی ہوا تھا۔ رانچی کی بات تو کل کی بات ہے۔ اس لئے میں کہتی ہوں کہ اردو کے مطالبے کو عوامی بنائیے۔ عوام کی طرف سے اس مطالبے کو آنے دیجئے تاکہ کوئی ہنگامہ، کوئی فتنہ اور کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو۔

وزیراعظم جیسے اپنی خاموش زبان میں کہہ رہی تھیں، مجھے غلط مت سمجھئے۔ مجھے اردو سے محبت ہے۔ پیار ہے۔ اور سچ پوچھئے تو عشق ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں انفرادی حیثیت میں کچھ نہیں کر سکتی۔ البتہ وزیراعظم کی حیثیت میں کچھ کر سکتی ہوں۔ بشرطیکہ اُردو کے مطالبے پر جمہور کی دستخط ہو۔

وزیراعظم جیسے کہہ رہی تھیں ــــــ

اور میں سوچ رہا تھا کہ ماضی میں ہم نے جمہور کے اس نسخے کو بھی آزمایا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ جب ہم نے بیس لاکھ سے زائد دستخطوں کے ساتھ ایک یادداشت صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ تو پھر کیا ہوا اس کا!

میں نے سوچا ان تمام باتوں کے پس منظر میں ایک بات ایمان دارانہ طور پر ہمیں ماننی پڑے گی کہ ماضی کی حکومت اور اس کی ناانصافیوں

www.taemeernews.com

کی ذمہ دار موجودہ حکومت نہیں۔ موجودہ وزیر اعظم نہیں۔ اور پھر اس سوجھ بوجھ کے ساتھ جب ہم مسز اندرا گاندھی، وزیر اعظم کے مختصر دور حکومت پر نظر ڈالیں تو یقیناً ایک روشن حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ عوامی بھلائی کے لئے کام کیا اور کر رہی ہیں اسلئے آج وزیر اعظم کا نام نئے سوشلسٹ سماج اور نئی عوامی قدروں کے لئے ایک علامت بن گیا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنی محبوب وزیر اعظم کی نیت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بلکہ ہمیں ان کے خلوص کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ انہوں نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے سب کچھ کہہ دیا۔ اگر مسز اندرا گاندھی کی بجائے کوئی اور وزیر اعظم ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اتنے حقیقت پسندانہ لہجے میں بات کرتا۔ اور خود اپنی گورنمنٹ کے خلاف لڑائی لڑنے اور جیتنے کے لئے آئینی گُر بتاتا جس سے فتح قریب نہیں تو دور بھی نہیں ہو سکتی!

اس کنونشن کو وزیر اعظم کے علاوہ مخاطب کرنے والوں میں ملک کے دوسرے معزز شہری بھی شامل تھے۔ ان میں قابل ذکر ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق، گیانی کرمکھ سنگھ مہاجر اور مرکزی وزیر صنعت و ترقی جناب فخر الدین علی احمد ہیں۔ اب سب حضرات نے اس وقت مخاطب کیا جب کہ وزیر اعظم کسی اہم کام کے سلسلے میں معذرت چاہ کر جا چکی تھیں۔ لیکن انہوں نے یہ خواہش کی تھی کہ ان کے جانے کے بعد بھی جلسہ کو جاری رکھا جائے

شیروانی میں ملبوس سرخ و سپید جناب غلام محمد صادق نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ کسی بھی زبان کو مٹانے کی جتنی کوشش کی جائے وہ

www.taemeernews.com

زبان مٹ نہیں سکتی۔ اُردو ایک زندہ اور جاندار زبان ہے۔ اس کے متعلق یہ افواہ پھیلائی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ مگر یہ غلطی غلط ہے۔

' کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا' کشمیر کے باشندوں کی مادری زبان جیسا کہ آپ جانتے ہیں کشمیری ہے اور ریاست کی سرکاری زبان فارسی ہے جو صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم نے ریاستی سطح پر اُردو کو اپنایا اور اسے ذریعہ تعلیم بنایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زبان کو بھی دوسری زبانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

گیانی کرتار سنگھ مہاجر نے اپنی گونجیلی آواز میں کہا' میں میمورنڈم سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ ہندی کے حامیوں نے دوسری زبانوں کے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہندی خود الگ تھلگ ہو کر اکیلی رہ گئی ہے۔ اردو کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے مہاجر جی نے کہا' اُردو قومی یک جہتی کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور علامت ہے۔ اُردو والے اگر پرجوش طریقے پر اپنے مطالبات کو آگے بڑھائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ پورے ملک کی بڑی خدمت ہوگی۔

جناب فخرالدین علی احمد نے کرسی صدارت سنبھالی اور کچھ اس طرح اپنی تقریر کا آغاز کیا' کرشن چندر نے جس خوبصورتی سے اردو کا مقدمہ پیش کیا اس کے لئے ہم سب ان کے مشکور ہیں۔ جس وقت یہ مقدمہ پیش کیا جا رہا تھا اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں اس عدالت میں کس حیثیت سے شریک ہوا ہوں؟ مدعی کی حیثیت سے، فریادی کی حیثیت سے یا جج کی

www.taemeernews.com

حیثیت سے !

وزیر اعظم کی تقریر سے پیدا کردہ غلط فہمی اور مایوسی کو دور کرتے ہوئے جناب احمد نے فرمایا' میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وزیر اعظم اردو کے مسئلہ کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ انھیں اس تعلق سے زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی کل ہی انھوں نے کانگریس سشن میں اردو کی حمایت اور تائید کی۔ محض اس لیے کہ رائے عامہ کو ہموار کیا جائے۔ رانچی کے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے مرکزی وزیر نے کہا کہ اردو کے مطالبات کو پرزور طریقے پر پیش کرنے اور اصرار کے ساتھ سنوانے کی کوشش میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ مطالبات کو بڑی سنجیدگی اور محتاط انداز سے پیش کریں۔

آخر میں سہ لسانی فارمولے پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے کہا کہ مرکزی سرکار نے تمام ریاستوں کے نام احکام جاری کئے ہیں۔ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں بھی اردو کو جگہ دی گئی ہے۔ اب امیدوار سوالوں کے جوابات اردو میں بھی لکھ سکتے ہیں۔ غرض ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ اور اب اردو والوں کو چاہیئے کہ دوسرے صوبوں میں بھی اردو کی مہم کو آگے بڑھائیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ لمحہ آہی گیا جب انا ونسرتے شکریئے کے ساتھ جلسے کے اختتام کا اعلان کیا۔ اور شب میں منعقد ہونے والے ادبی جلسے اور مشاعرے میں شرکت کی درخواست کی۔

جلسے کے ختم پر لوگ تھکے ہوئے دماغوں اور بوجھل قدموں کے ساتھ

www.taemeernews.com

آہستہ آہستہ ہال سے باہر جانے لگے۔ ہال سے باہر کی اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر دھوکہ ہے دل و جان کے سودے ہیں۔ ہنگامے ہیں۔ مکر اور فریب کے جال ہیں۔ بھگوان اور خدا کے جھگڑے ہیں۔ جہاں کسی کو کسی کی پرواہ نہیں۔ ایک مرتا ہے۔ دوسرا عیش کرتا ہے۔ جاہل انگوٹھا لگا کر لاکھوں کماتا ہے اور پڑھا لکھا بھوکوں مرتا ہے۔ شرافت اور رذالت کی باتیں بے معنی ہیں۔ ہر شے اضافی ہے۔ کوئی قدر مستقل نہیں۔ مستقبل بجز اس کے نام ہے ماضی ایک بھولی بسری کہانی ہے۔ حال ایک حقیقت ہے۔ اپنی خوشی اپنی تسکین کی خاطر جو چاہے کرو۔ ہر شے جائز ہے۔ باہر کی اس دنیا میں جہاں سخت حالات کی چلچلاتی دھوپ پھیلی ہوئی ہے اور جہاں سانس لینا بھی ایک مسئلہ ہے۔

لیکن جب وہ ہال کے اندر داخل ہوئے تھے تو انہیں یوں لگا جیسے ایک لمحہ کے لئے۔ چند لمحوں کے لئے ان کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ بڑے اطمینان سے انہوں نے سانس لی۔ بالکل اس مسافر کی طرح جس کی منزل نظروں کے سامنے چمکتی ہے۔ اور جسے ابھی چند قدم ہی چلنا ہے۔ لیکن چند لمحوں کے بعد ہی انہیں پتہ چل گیا کہ ابھی منزل نظروں سے اوجھل ہے۔ دور ہے۔ وہ چند گھنٹے برلا ہال میں بیٹھے رہے۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا جیسے وہ اس ہال میں کئی صدیوں، مہینوں اور برسوں سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیس سال سے۔ بائیس سال سے ——

نیا سماج بن رہا ہے۔ بہار آ رہی ہے۔ چاند اور زمین کا فاصلہ کم ہو گیا ہے۔ دنیا ایک چھوٹے سے مشترک خاندان میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ قومیت اور تعصب کی دیواریں دھڑا دھڑ گرتی جا رہی ہیں۔

www.taemeernews.com

دنیا سکڑتی جارہی ہے۔ اور انسان کا قد اور اس کی سماجی پوزیشن بلند ہوتی جارہی ہے۔ آج کا انسان ساری دنیا کا شہری ہے۔ ورلڈ سیٹیزن ــــ انسان ــــ انفرادی آزادی ــــ عوام ــــ جمہوریت ــــ

زیدی صاحب خاموش ہیں۔ ان کا لڑکا چپ ہے۔ میری لڑکی کچھ بھی نہیں جانتی۔ میری بیوی اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہوئی بھی کچھ نہیں سمجھتی۔ شاید وہ کل کے اخبارات کو پڑھ کر کچھ کچھ سمجھنے لگے۔ لیکن نہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھے گی۔ کوئی بھی کچھ نہیں سمجھے گا۔ مدرسوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، عدالتوں اور دفتروں میں بیٹھ کر یہ بات نہیں سوچی جاسکتی۔ ہوٹل، پارک، سینما اور تفریح گاہوں میں صرف دل کو بہلایا جاسکتا ہے۔ گلی کوچوں اور سڑکوں پر ایسی باتیں سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ جھگڑے کی بات ہے۔ ایسی باتیں برلا ہال میں یا پھر کسی اور شہر کے خوبصورت ایر کنڈیشن ہال میں بیٹھ کر سوچی جاسکتی ہیں۔ مسائل کو میز پر حل کیجیے۔ یہی مہذب انسانوں کا طریقہ ہے۔ لیکن ہم برلا ہال میں بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہیں۔ ابھی ہمیں اور کتنے سال برلا ہال میں بیٹھنا پڑے گا!

ابھی ابھی یہاں جو لوگ تھے وہ سڑکوں اور شاہراہوں سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے لیکن راستہ بھر یہ سوال ان کے ویران دل اور روح کی وادیوں میں گونجتا رہے گا کہ کب صبح ہوگی۔ اور کب ہمارا مسئلہ حل ہوگا۔ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ نئے سوشلسٹ سماج کی شکیل عمل میں آچکی ہے۔ لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ وہ سوشلسٹ

www.taemeernews.com

سماج کب اس دھرتی پر جنمے گا جس میں محبت، رواداری اور انسان دوستی ہی سب کچھ ہوگی!

صبح شام کی طرح، روز کی طرح آج بھی کھانے کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ اسلامیہ کالج کے طلبا اپنے مہمانوں کی بڑی توجہ سے خاطر کر رہے تھے انہیں اپنی فکر نہیں تھی۔ اور اگر کوئی فکر تھی تو یہی کہ باہر سے آنے والے مندوبین کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ خود کب کھاتے تھے۔ اور کب اپنے اپنے گھروں کو جاتے تھے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب دیکھو یہ طالب علم والنٹیر کا بیاج لگائے کسی نہ کسی کام میں مصروف ہیں۔ کبھی مہمان کو جلسہ گاہ کی طرف لے جا رہے ہیں تو کبھی جلسہ گاہ سے اسلامیہ کالج کی طرف لا رہے ہیں۔ اور کبھی ایک ایک سے پوچھ رہے ہیں —

آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں؟

یہ نوجوان بڑے پیارے تھے معصوم تھے۔ اور ان کے کھلے ہوئے چمکتے ہوئے چہروں پر جیسے طلوع ہوتی ہوئی سحر کی روشنی تھی۔ ان کے یہاں عزم تھا اور کسی بھی لاحاصل شئے کو حاصل کرنے کا جذبہ۔ یہ منطق کی زبان سے زیادہ محبت اور پیار کی زبان کو سمجھتے تھے۔ میں نے محسوس کیا جیسے ان طالب علموں اور میرے کالج میں پڑھنے والے طالب علموں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ طالب علم خواہ بمبئی کا ہو یا ناندیڑ کا یا حیدرآباد کا یا ملک کے کسی بھی حصہ کا ایک سا ہے۔ بشرطیکہ اُسے سمجھنے کی کوشش کی جائے اس سے قریب ہو کر اس سے بات کر کے، اور اس کی بات سُن کر۔ اور پھر اس کی

www.taemeernews.com

بڑے خلوص سے رہنمائی کی جائے۔

ان طلبا کے رہنما جناب سید عبد الحی لکچرر، مہاراشٹرا اسلامیہ کالج بھی مصروف ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے وہ تعریف اور تحسین سے بلند ہو کر ایک مشین کی طرح کام کر رہے تھے۔ اور بھی کئی شخصیتیں تھیں جن کی رہنمائی اور سرپرستی طلبا کو حاصل تھی۔

آپ سے ملئے۔۔ آپ ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، لکچرر

آپ ہیں مشتاق احمد لکچرر

اور آپ ہیں اے اے۔ منشی کالج کے پرنسپل

مہاراشٹرا کالج کے پرنسپل سے ملنے کے بعد مجھے اپنے دوست ڈاکٹر حسینی شاہد، پرنسپل، حیدرآباد اردو آرٹس کالج یاد آگئے۔ دونوں اپنے پرخلوص لب و لہجے، شخصیت اور مسکراہٹ میں ایک دوسرے سے کتنے مشابہ ہیں! میں نے سوچا۔

مہاراشٹرا کالج کی ترقی کا راز یہی ہے کہ اسے اتنا مخلص اور باعمل اسٹاف ملا۔ ورنہ ایک سال پہلے اس کالج کا نام و نشان نہ تھا۔ لیکن آج صرف کالج ہی نہیں بلکہ اس کی اپنی ذاتی عمارت ہے۔ ایک سال میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ ابھی کچھ تعمیری کام باقی ہے۔ عمارت بن رہی ہے۔ اینٹ چونا سمنٹ اور پتھر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں۔

کسی عمارت کو ڈھانا کتنا آسان اور بنانا کتنا مشکل کام ہے تخلیق یوں ہی نہیں ہوتی اس کیلئے اس کرب سے گزرنا پڑتا ہے جو جسم اور روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ اس کالج کے خالق یقیناً کرب کی اس لذت سے واقف ہیں جو انھیں کسی کام کے لئے اکساتی ہی نہیں بلکہ ان میں ایک دیوانگی کی

www.taemeernews.com

کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لیئے تو مہاراشٹرا کالج بمبئی دیکھتے ہی دیکھتے۔ اُردو کمیٹی کے مہمانوں کے لئے "ڈیلی گیٹس کیمپ" بن گیا۔

بتایئے آج شام کا کیا پروگرام ہے؟

ایک طالب علم والنٹیر نے قریب آکر بڑے خلوص سے پوچھا۔

ابھی کچھ سوچا نہیں۔ ویسے مشاعرے تک وقت گذارنے کے لئے کہیں نہ کہیں باہر جانا ہی پڑے گا۔

طالب علم نے مسکراتے ہوئے کہا' جی ہاں اسی لیئے تو ہم نے آپ حضرات کیلئے آج ایک پروگرام ترتیب دیا ہے۔ آپ شام کو ذرا بمبئی گھوم پھر کر آیئے۔ موٹروں کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اپنی سہولت کے لئے کسی نہ کسی طالب علم والنٹیر کو ساتھ رکھ سکتے ہیں۔

اس غیر متوقع پروگرام سے کچھ خوشی ہوئی۔ اور چند لمحوں کے لیئے سہی ذہن پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر سبھوں نے ساتھ شام کی چائے پی۔ اور تفریح کی غرض سے نکل پڑے۔

ہمارا گائیڈ ڈگری کلاس میں پڑھنے والا آرٹس کا ایک طالب علم تھا۔ اس نے بڑی شستہ انگریزی میں ہم سے پوچھا' آپ کہاں چلنا پسند کریں گے۔

بمبئی میرے لئے نئی نہیں تھی۔ اور شاید دوسروں کے لئے بھی۔ اس لئے دوسروں نے بھی میرے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ جہاں بھی وہ لے جائے۔ اور بمبئی کے جس رخ کو وہ ہمیں دکھانا پسند کرے ہم شوق سے دیکھیں گے۔

www.taemeernews.com

اور پھر سہ پہر ہی وہی اسکول بس بمبئی کی لمبی چوڑی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

یہ بمبئی ہے۔
یہ گیٹ وے آف انڈیا ہے۔
یہ میرین ڈرائیو ہے
یہ چوپاٹی ہے۔
اور یہ وہ عورت ہے جسے بمبئی کہتے ہیں!

بوڑھا سورج اپنی آخری نگاہ ساحل سمندر پر ڈال رہا تھا! کنارے کنارے انسانی سروں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید لوگ دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیتوں کے بعد کھلے آسمان اور کھلی فضا میں سانس لینا زیادہ پسند کرتے۔ اسی لیے تو ہر قسم، ہر نہج اور ہر طبقے کے لوگ یہاں نظر آ رہے تھے۔ ایک وہ طبقہ جو نرم نرم قالینوں پر چلتا ہے۔ اور ہوائی جہازوں میں اڑتا ہے۔ دوسرا وہ جسے پیٹ بھرنے کے لئے ایک سوکھی روٹی بھی نصیب نہیں۔ اور تیسرا وہ جو ان دونوں کے بیچ میں جھولتا رہتا ہے۔ نہ امیر نہ غریب۔ اور جسے آج کی اصطلاح میں متوسط کہتے ہیں۔ اور جو ہمیشہ اپنی ناک کو بچانے کی کوشش کرتا ہے کہ کہیں کٹ نہ جائے!

اس سفید کالر والے طبقے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے سمندر سے اٹھنے والی طوفانی لہروں کی زد میں آتا ہے لیکن

www.taemeernews.com

تباہ و برباد ہو کر بھی کالر کی سفیدی کو باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی اور انسانیت کی تمام اعلیٰ قدریں جیسے اس سے عبارت ہیں!

آئینے اور سمندر کے سامنے بوڑھا بھی جیسے بچہ بن جاتا ہے۔ میرے اور ساتھی جو قریب قریب بیس تھے تین تین، چار چار کے گروپ بنا کر یہاں وہاں گھومنے چلے گئے۔ باقی ہم چار بچے تھے۔ ایک تو میں۔ دوسرے ایک معمر بہاری ڈیلی گیٹ جن کا میں نام بھول رہا ہوں۔ تیسرے یو پی کے اردو محافظ دستہ کے ایک رکن۔ اور چوتھا نوجوان طالب علم گائیڈ۔

طالب علم ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو، سمندر کے کنارے گائیڈ بے کار ہو جاتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کا کوئی گائیڈ سمندر کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا اس لئے آپ خود سمندر کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی!

نیلگوں آسمان کی طرح حدِ نظر تک پھیلا ہوا سمندر خاموش اور پرسکون تھا۔ ہلکی ہلکی ہواؤں کے دوش پر لہریں کسی اچھے تیراک کی طرح پانی کی سطح پر بچلتی، ڈوبتی اور سر اٹھاتی ہوئی ساحل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ساحل تک پہنچتے پہنچتے ان کی سانس پھولنے لگتی یہاں تک کہ وہ آخری ہچکی کے ساتھ ساحل کو چوم کر ختم ہو جاتیں۔ ان میں سے بھی کوئی قد آور اور طاقت ور لہر اپنے منہ سے کف چھوڑتی ہوئی ساحل سے آگے بڑھ جاتی۔ ریت پر یا کسی پتھر پر اپنا سر پٹک پٹک کر مر جاتی۔

ساحل کی تمنا اور اس کے حصول کے لئے یہ ننھی ننھی لہریں سمندر کی بھی پرواہ نہیں کرتیں۔ کیا ساحل کی تمنا اتنی شدید اور فطری ہوتی ہے؟

www.taemeernews.com

لیکن یہ بات لہروں سے کیسے پوچھی جائے۔ لہروں کی اور سمندر کی کونسی زبان ہوتی ہے؟

دنیا کی تمام زبانوں کی تاریخ میں سمندر کی زبان کا ذکر نہیں ملتا حالانکہ سمندر کی زبان بھی اتنی ہی قدیم اور ازلی ہے جتنی آدم اور حوا کی زبان۔ بلکہ اس سے بہت پہلے جبکہ کچھ نہ تھا سمندر تھا۔ اور اونچی اونچی اٹھتی ہوئی طوفانی لہریں!

یہ دوسری بات ہے کہ انسان سمندر کی زبان نہیں سمجھتا لیکن سمندر انسان کی زبان سمجھتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک اور ہر حصے کے باشندوں کی زبان سے وہ واقف ہے۔ سمندر سینکڑوں زبانوں کو جانتا ہے۔ اور ہر چھوٹی بڑی زبان کے ارتقا میں سمندر کا بڑا ہاتھ ہے۔ کتنی ہی زبانوں کے لوگ گیت اور کتنے ہی شاعروں، ادیبوں، مفکروں، دانشوروں، حکیموں اور فلسفیوں کے خیالات کو اس سمندر نے یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں تک پہنچایا ہے۔ مشرق، مغرب اور شمال و جنوب کے فرق کو مٹانے والا یہی سمندر ہی تو ہے۔ سمندر انسان کا دوست ہے۔ اور اس کا تہذیبی محافظ بھی!

اس سمندر نے کتنے ملکوں، کتنی حکومتوں اور کتنی قوموں کی تاریخ کو مٹتے اور بنتے دیکھا ہے۔ سمندر کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اور نہ اس کے بڑے چھوٹے سفیر جو صدیوں سے ساحل کی طرف لپک لپک کر آرہے ہیں۔

ساحل پر انسانوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی میلہ لگا ہے ——

www.taemeernews.com

ناریل کا پانی لو ـــــ ناریل کا پانی۔

کوئی پکار رہا تھا!

اور کوئی جیسے چیخ رہا تھا۔ ناریل ـــــ ناریل!

اور کوئی جیسے گا رہا تھا ـــــ

چنا جور گرم بابو ـــــ

اور کوئی بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے پکار رہا تھا۔

لال لال غبارے ـــــ غبارے ـــــ

بچے غبارے اڑا رہے تھے۔ بچے ریت پہ کھیل رہے تھے۔ بچے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے۔

انسان سمندر کے سامنے بچہ ہی تو ہے!

سمندر کی ایک اونچی لہر کف اڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور ساحل پر ایک جل پری کو چھوڑ کر کہیں کھو گئی!

جل پری ریت پہ جیسے لوٹ پوٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی کی آواز نے قریب کے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیا!

سبھوں نے یہی سمجھا کہ وہ ایک جل پری ہے۔ حالانکہ وہ جل پری نہیں تھی۔ وہ تو اسی زمین کی ایک لڑکی تھی کوئی بیس یا بائیس سال کی عمر۔ اونچے قد کی چھریرا بدن۔ کولھے اور پنڈلیاں گوشت سے پُر۔ رنگ سانولا مگر تانبے کی طرح چمکتا ہوا۔ اور جسم کے چند حصوں پر واجبی سا کپڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی کمر کے اطراف اپنے ہاتھوں کا حلقہ بنایا اور پھر دوڑنے لگے!

معمر بہاری ڈیلی گیٹ نے لڑکی اور لڑکے کو سامنے آتا ہوا دیکھ کر لاحول پڑھی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

www.taemeernews.com

لیکن دوسری طرف بھی یہی منظر تھا!
چاروں طرف نیم برہنہ لڑکیاں، عورتیں اور مرد نہا کر سمندر سے برآمد ہو رہے تھے۔

اس بار بہاری ڈیلی گیٹ باقاعدہ لاحول کا ورد کر رہا تھا!
طالب علم گائیڈ جیسے شرمندہ تھا۔ اور انجان بن کر وہ پھیلے ہوئے سمندر کے دوسرے کنارے کو دیکھ رہا تھا!
اُردو محافظ دستہ کا رکن پان کھانے اور پان آفر کرنے میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا!

اور میں!

میں سوچ رہا تھا کہ اس میں سمندر کا کیا قصور ہے۔ سمندر ہر اس امانت کو انسان کے حوالے کر دیتا ہے جو اس کے سپرد کی جاتی ہے۔ درآمد برآمد کی جانے والی اشیا جیسی بھی ہوں ان کا ذمہ دار سمندر تھوڑی ہے۔ یہ سوال تو ان سے پوچھا جائے جو اصلی نقلی، اچھی بری، نئی پرانی اور انسانی جسموں کا بزنس کرتے ہیں!
اچھی چیزوں کو قبول کرو اور بری کو رد ـــــ
انسانی تاریخ کا شعور یہی کہتا ہے!
لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہم سمندر سے آنے والی ہر شئے کو اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں اور فخر سے دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ فارن ہے۔
یہاں تک نہیں بلکہ ہم اپنی نجی زندگی میں بھی ان چیزوں اور اقدار کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جو سات سمندر پار سے آئی ہیں!

www.taemeernews.com

اس سے پہلے صدیوں پہلے ہم نے ان تاجروں کا استقبال کیا تھا جو سات سمندر پار سے آئے تھے۔ جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر کے ہم سے ہماری ہر شے چھین لی تھی ہمارا گھر، ہماری روٹی اور ہماری عزت اور ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم جانوروں کی طرح زندگی گذاریں۔ لیکن آج جب وہ اس سمندر کو پھلانگ کر اپنے ملک چلے گئے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ یہیں کہیں چھپے بیٹھے ہیں!

سمندر سے اٹھنے والی ہر لہر ساحل سے ٹکرا رہی تھی۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے ذہن کے کناروں سے ٹکرا رہی ہے میرے دل سے ٹکرا رہی ہے اور مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ کیا واقعی تم آزاد ہو!

میں نے کہا ——— بے شک ———

میرے جواب پر سمندر کی لہریں ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں، بھئی تم بڑے معصوم معلوم ہوتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری یہ معصومیت جہالت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ ورنہ غور کرو کہ انگریزوں کے زمانے میں جو غلامیتیں تھیں وہ اب تک باقی ہیں اور دن بدن اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لوٹ کھسوٹ کا وہی انداز ہے۔ اور تم کسی نہ کسی طرح آج اپنے ہی ہم وطنوں کو لوٹ رہے ہو اور ان کا قتل کر رہے ہو ———

قتل بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ قتل جس میں پولیس کو مقتول کی لاش مل جاتی ہے۔ لیکن قاتل کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرا وہ قتل جس میں نہ لاش ہی ملتی ہے اور نہ قاتل۔ اور نہ جس کا اندراج پولس

www.taemeernews.com

کے کسی رجسٹر میں ہوتا ہے۔ ایسا قتل ہر روز ہر لمحہ ہوتا ہے۔ ملک کے ہر بڑے چھوٹے شہر میں، دیہات میں، کھیت میں۔ کارخانے میں۔ اور تم اس قتل سے انکار نہیں کر سکتے۔ جہاں جاؤ اور جدھر جاؤ۔ دھوئیں کا ایک چمکتا ہوا چھرا نظر آئے گا۔ گوشت بیچنے والا قصاب اور نبض پر ہاتھ رکھنے والا ڈاکٹر ذہنی طور پر ایک ہی سطح پر آ گئے ہیں۔ ایک ڈنڈی مار کر گاہک کو لوٹتا ہے۔ دوسرا اپنی سلین کی بجائے ڈسٹل واٹر کا انجکشن لگا کر مریض سے پیسے وصول کرتا ہے۔ کسی بھی میدان میں چلے جاؤ وہی قاتل دھوکا اور تعصب کا چھرا تیز کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یوں لگتا ہے جیسے انسان مر گیا ہے۔ صرف شیطان باقی رہ گیا ہے۔

لہریں جو کہہ رہی تھیں!

اور جانتے ہو یہ سب کچھ آزادی، عوام اور جمہوریت کے نام پر ہو رہا ہے۔ حالانکہ آج بھی عوام اتنے ہی غریب ہیں جتنے پہلے تھے۔ اور ساتھ ساتھ بھوکے بھی ـــــ پہلے ایک آقا تھا ـــ ملک کے باہر۔ اور آج کئی آقا ہیں۔ ملک کے اندر ـــــ آقا اور خادم!

باس اور سپاہ ڈینٹ!

یہ ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ ویسے اصطلاحیں بدل گئی ہیں۔ نئے نئے الفاظ زبان میں اور سماجی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں لیکن زندگی کی گاڑی اسی کھردری اور ٹیڑھی میڑھی سڑک پر چل رہی ہے!

تم ہی سچ سچ بتاؤ دیس کے بڑے نیتا مہاتما گاندھی نے کیا اسی لیے آزادی حاصل کی تھی۔ کیا ان کی یہی تعلیمات تھیں؟

www.taemeernews.com

آقاؤں کے بدل جانے سے زندگی کبھی نہیں بدلتی!

لہریں جو کہہ رہی تھیں! سچ پوچھو تو ابھی تک تم ذہنی طور پر غلام ہو۔ تم میں قوت فیصلہ ہے اور نہ اچھے بُرے کی تمیز۔ تم آنکھیں بند کئے دوسرے ممالک کے عوام کی بھونڈی نقل کرتے ہو اور اس کے بعد بھی اپنی آزادی کا دعویٰ کرتے ہو۔ بھئی واہ واہ کیا کہنے تمہارے جواب کے!

وہ ہپی قسم کی لڑکی اور لڑکا اپنی ٹانگیں پھیلائے ریت پر چت پڑے تھے۔ بہاری ڈیلی گیسٹ نے گذرتے ہوتے ہوئے ایک اچٹتی سی نظر ڈال ہی لی۔ معلوم نہیں اس نے اس بار لاحول پڑھی یا نہیں۔ طالب علم گائیڈ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ رات میں منعقد ہونے والے مشاعرے کے انتظامات کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ محافظ دستہ کے سرگرم کارکن نے مجھے چوتھا پان دیتے ہوئے کہا' بھئی واللہ مزہ آگیا!

ابھی میں پان کے لئے شکریہ ادا کرنے بھی نہ پایا تھا کہ ناریل بیچنے والی عورت اچانک سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور بولی، بابو ایک ناریل لے لو۔ ... ایک ——

لہجہ میں بڑی درخواست تھی۔ التجا تھی۔ فریاد تھی۔ جیسے وہ ناریل بیچ نہیں رہی تھی بلکہ بھیک مانگ رہی تھی۔

یہ کوئی پہاڑی عورت معلوم ہوتی تھی جسم سیاہ اور چمکیلا تھا۔ ویسے وہ جوان تھی۔ لیکن اسے اپنے جسم اور اپنی جوانی کا ہوش نہ تھا۔

www.taemeernews.com

اور یوں بھی جوانی میں کسے ہوش رہتا ہے۔ لیکن یہ بے ہوشی جوانی کی مستی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ غربت افلاس اور چلتے ہوئے ٹاقوں نے اس کی نسائی حیا چھین لی تھی۔ چیتھڑے اس کے پھیلے ہوئے جسم کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر رہے تھے۔ چھاتیاں پھٹی ہوئی انگیا کے باہر نکل پڑی تھیں۔ ایک چھاتی پر اس کا بچہ چمٹا ہوا چسر چسر دودھ پی رہا تھا۔ دوسری چھاتی کے منہ پر اسی بچے کا ہاتھ کچھ اس طرح تھا جیسے وہ اپنے دودھ کے چشمے کی حفاظت کر رہا ہو اور اسے ڈر ہو کہ کہیں کوئی اور اس پر قبضہ نہ کر لے۔

اور جب نظریں اوپر سے نیچے کی طرف آئیں تو پتہ چلا کہ ساڑی نام کی کوئی چیز وہاں ہے ہی نہیں۔ صرف ایک میلا سا چیتھڑا تھا جو اس کی کمر اور کولھوں سے نیچے تک آکر غائب ہو گیا تھا۔ باقی ہر شئے واضح صاف اور تھرکتی ہوئی!

اس پہاڑی عورت اور اس ہپی لڑکی میں مجھے کوئی فرق نہیں معلوم ہوا۔ دونوں برہنہ تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کو بیرون ملک کی لہر نے ننگا کر دیا تھا۔ اور دوسری کو اندرون ملک کی لہر نے ــــ

بابو، ایک ناریل لے لے۔

پہاڑی عورت جیسے بھیک مانگ رہی تھی!

یوپی کے ڈیلی گیٹ نے فوراً ناریل خریدا۔ اور پھر اس کی مساوی تقسیم کرتے ہوئے ناریل کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا بھئی واللہ مزہ آگیا!

پھر وہی اسکول بس سڑکوں پر دوڑنے لگی!

www.taemeernews.com

یہ بمبئی ہے۔ ایک کاسموپولیٹن شہر۔ دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر خطہ کا آدمی آپ کو یہاں نظر آئے گا قسم قسم کی زبانوں اور قسم قسم کے کلچر کو دیکھنا ہے تو بمبئی آئیے بمبئی امیروں اور غریبوں کا شہر ہے ہر تیس منزلہ عمارت کے قدموں میں ایک جھونپڑی بھی تیز ہواؤں کی زد میں لرزتی ہوئی نظر آئے گی۔ یہاں دیکھتے ہی دیکھتے لکھ پتی کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ اور بھکاری اور بھکاری۔ اللہ کی شان ہے۔ دیکھئے انسان اور کتے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ بس رک گئی ہے سگنل کی تیز سرخ روشنی جب تک سبز رنگ میں تبدیل نہیں ہوگی بس رکی رہے گی۔ لہٰذا اس لڑائی ہی کو دیکھتے چلئے۔ وہ جو سامنے ہوٹل نظر آ رہی ہے۔ میں وہاں کی بات کر رہا ہوں۔ جی بالکل وہیں کی۔ بجلی کے کھمبے کے پاس چار پانچ بھکاری چیتھڑے لگائے کھڑے ہیں لیکن سب اس بچی کچی غذا پر ٹوٹ پڑے ہیں جسے ہوٹل کے بیرے نے پتر لیل میں لپیٹ کر ابھی پھینکا ہے۔ اس میں یقیناً گوشت اور ہڈیاں نہیں ہوں گی۔ کیونکہ یہ کوئی برہمن ہوٹل ہے۔ قریب ہی تاک میں کھڑے ہوئے کتے بھی اس پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ انسان ان کے منہ کا نوالہ چھین لے۔ اور انسان یہ نہیں چاہتا کہ کتے اس کی غذا میں برابر کے حصے دار بن جائیں۔ چنانچہ اسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ کتے بھوں بھوں والی زبان میں غرا رہے ہیں اور بھکاری انہیں پتھروں سے مار رہے ہیں!

ٹرافک رک گئی ہے۔ منجمد ہو گئی ہے۔ ایک لمحہ میں درجنوں موٹروں کی ایک قطار لگ گئی ہے۔ پتہ نہیں کتنے لوگ، وقت گذارنے کے لئے اس تماشے کو دیکھ رہے ہیں۔ شاید یہاں میں نے تماشہ کہا غلط

www.taemeernews.com

غلط استعمال کیا ہے۔ مجھے کہنا چاہیے تھا کہ بیسویں صدی کے اس سب سے بڑے المیے کو۔ انسان اور کتے کی لڑائی ـــــ کتنی عجیب سی بات ہے۔ ہے نہ!

اس لڑائی میں کون حق پر ہے اور کون ناحق۔ شاید کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یوں بھی یہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہونے والا نہیں۔ کیونکہ یہ تنازع البقاء کا مسئلہ ہے اور اپنی بقا کے لیے ہر جاندار جدوجہد کرتا ہے۔ اور یہ اس کا حق ہے۔ لیکن یہ کیسے طے ہو۔ اس لیے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ایک آل انڈیا کنونشن بلایا جائے۔ اور ملک کے بڑے بڑے مفکرین سے اس بات کی درخواست کی جائے کہ وہ اس سنگین لڑائی کا کوئی حل نکالیں۔ ورنہ اس بات کا ڈر ہے کہ یہ لڑائی گلی سے نکل کر سڑک پر آجائے اور سگنل کی سبز روشنی کے بعد بھی ٹریفک آگے نہ بڑھے۔

سبز روشنی کے ساتھ ہی ہماری بس دوڑنے لگی ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ ہماری فلم انڈسٹری کا کوئی ذہین ڈائرکٹر اس لڑائی کے اس منظر کو اپنی فلم میں پیش کرے تو وہ کتنی ہٹ جائے گی۔ یا کوئی آرٹسٹ اس منظر کو پینٹ کرے۔ یا آرٹ کی کسی انٹرنیشنل قسم کی نمائش میں بھیج دے تو یقیناً اس کی تصویر کو پہلا انعام ملے گا۔ یا کوئی پریس فوٹوگرافر اخبارات کے پہلے صفحے پر اس تصویر کو ریلیز کرے تو کیا ملک کے پڑھے لکھے طبقے کے لئے وہ ایک دن موضوع بحث نہیں بنے گی؟ اور کیا دھڑا دھڑ اخبارات نہیں بکیں گے!

میں سوچ رہا ہوں۔ بس دوڑ رہی ہے، بس میں بیٹھا ہوا ہر فرد اپنی اپنی سوچ میں گم ہے۔ شام ہو چکی ہے۔ رات ہو چکی ہے چراغ

www.taemeernews.com

جل اٹھے ہیں۔ بجلی کے بلب جل اٹھے ہیں۔ سو کینڈل پاور کے بلبس ۔ پانچ سو کینڈل پاور کے بلبس۔ روشنی کا ایک سمندر ہے جو بہہ رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی میرین ڈرائیو کو ـــــ فالکنڈ روڈ کو ـــ محمد علی روڈ کو اور سپیلا ہاوز کو ـــ

میں دیکھ رہا ہوں، جوان جوان عورتوں کو جو اپنی کمروں کو لچکا کر اور کولھوں کو مٹکا کر ہر گذرنے والے کو اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ یہ عورتیں جو سلاخوں کے پیچھے سگریٹ پیتی ہوئی ٹہل رہی ہیں۔ اور گندے گندے فقروں سے لوگوں کی مردانیت کو چیلنج کر رہی ہیں۔

اجی ادھر آؤ ـــ اجی یہاں آؤ۔

جیسے ان کے جوان جسموں کا روں روں پکار رہا ہے۔ اور دعوت عمل دے رہا ہے!

ان عورتوں کی قیمت دو روپے سے لے کر بیس پچیس اور سو روپے تک ہے۔ ایک گھنٹہ کے لئے۔ ایک رات کے لئے۔

یہاں آؤ ـــ ہمارے پاس ـــ ہمارے پاس۔

عورتیں اشاروں سے، میلی کچیلی ہنسی سے اور بڑے چھچھورے انداز سے ہاتھوں کو نچا نچا کر بلا رہی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ شاید اب بس رکے گی اور ہمارا گائڈ کہے گا کہ دیکھئے اصلی بمبئی تو یہاں ہے!

لیکن بس رکتی نہیں ہے۔ بس دوڑ رہی ہے۔ اور اب تو پتہ نہیں کہ ہم کس سڑک سے گذر رہے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہر حال یہ بھی بمبئی کی ایک سڑک ہے۔ اور ہم بمبئی کی تفریح کر رہے

www.taemeernews.com

ہیں جی ہاں یہ بمبئی ہے جہاں ہر شئے خریدی اور بیچی جاتی ہے۔ اور ہر ایک کی کچھ نہ کچھ قیمت مقرر ہے۔ صرف ایک شئے ہے جس کی کوئی قیمت نہیں۔ اور اس شئے کا نام ہے شرافت!

بس نہ جانے کن کن سڑکوں اور راستوں سے ہوتی ہوئی اب اس سڑک پر آگئی ہے جہاں اسلامیہ مہاراشٹرا کالج واقع ہے منزل قریب آگئی ہے۔ بمبئی ہم نے دیکھ لی۔ ناریل بیچنے والی عورت کی آواز اور ٹپی لڑکی کی ہنسی ذہن میں گونج رہی ہے۔ سلاخوں کے پیچھے مقید عورتوں کی ہنسی ہنسی نہیں ہے۔ وہ منظر کتنا تکلیف دہ ہے۔ کیوں بار بار کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی ہے۔ انسان اور کتے کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔ کتا کتا ہے۔ اور انسان انسان عظیم دنیا کا عظیم اور آزاد شہری۔ ابھی حال حال میں اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری نے فرد کے حقوق کی حفاظت کو مقدس فرض قرار دیا ہے۔ انسان جاگ گیا ہے۔ کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ سب برابر ہیں۔ سب کو ترقی کے مساوی مواقع ہیں۔ ہم سے کوئی بھی صدر جمہوریہ کے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن سمندر کی لہروں کا شور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ سمندر کی لہریں کیا کہہ رہی ہیں!

اب ہم اسلامیہ مہاراشٹرا کالج کی باؤنڈری میں کھڑے ہیں۔ جیسے کہیں گئے ہی نہیں تھے۔ جیسے ابھی ابھی برلا ہال سے آرہے ہیں۔ اور کوئی ہم سے کہہ رہا ہے، اُردو کا جھگڑا سڑکوں پر نہیں بلکہ میز پر حل ہونا چاہئے۔ میز ـــــ سڑک ـــــ اردو کنونشن ـــــ

www.taemeernews.com

— مشاعرہ — ادبی اجلاس!

اور کوئی جیسے میرے کانوں میں کہہ رہا ہے۔ ابھی جواب نہیں۔

واللہ مزہ آگیا!

شیفر روڈ پر صابو صدیقی المالطیفی کے وسیع میدان میں کرسیاں بڑے سلیقے اور ترتیب سے اس طرح سجائی گئی تھیں کہ کہیں بھی بیٹھو لیکن ڈائس کا ہر گوشہ نظروں کے سامنے تھا۔ کئی سو کینڈل پاور بلبس کی روشنی جہاں پورے میدان میں پھیل رہی تھی وہیں ڈائس پر بھی۔ یہی نہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تمام بلبس کا رخ ڈائس کی طرف ہے اور وہیں سے روشنی کا دریا نکل کر چاروں طرف بہہ رہا ہے۔

نشستیں پُر ہو چکی تھیں اور جناب صدر کا انتظار تھا!

پتہ نہیں ہمارے ملک میں جناب صدر کیوں دیر سے آتے ہیں۔ کیا دیر سے آنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے!

اردو کمیٹی کے سکریٹری سید محمد زیدی نے ملک کی چودہ زبانوں کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہماری دعوت پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں جس کے لئے ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ آپ نے اردو کی جس پذیرائی الفاظ میں حمایت کی ہے اسے ہم اور اردو بولنے والے کبھی نہ بھولیں گے۔ آپ کی اخلاقی تائید سے ہمیں ایک نیا حوصلہ ملا ہے۔ عوام آپ کو اپنے شہروں کو دیکھنے کے لئے بے چین ہیں۔ اس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہاں

www.taemeernews.com

ڈائس پر تشریف لائیں۔

اس کے بعد زیدی ایک ایک کا نام پکارتے گئے۔

شودان سنگھ چوہان، ہندی کے بڑے نقاد اور مصنف۔

مسز چوہان، ہندی کی مشہور ادیبہ۔

بی۔ وینکٹ رامیا، تلگو زبان کے مشہور شاعر، ادیب اور نقاد

پروفیسر ستیہ رامیا، کنڑی کے نقاد اور شاعر

امریتا پریتم، پنجابی زبان کی مقبول ادیبہ

چترنجن، مشہور بھوج پوری شاعر

اس طرح پہلے نام پکارا جاتا تھا۔ اور پھر عوام سے تعارف۔ اور پھر زیدی اس فن کار سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتے تھے۔ آئیے۔ آئیے ——— ادھر تشریف رکھیے ——— ادھر ———

اس طرح یہ سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے تک چلتا رہا!

فن کار، اپنا نام سن کر ڈائس پر آتے تھے۔ اور سامنے بیٹھے ہوئے سینکڑوں گم نام لوگوں کو جھک کر سلام کرتے تھے۔ اور یہ گمنام لوگ جو نہ جانے کیا کیا کام کرتے تھے اور کہاں کہاں سے آتے تھے۔ پرزور تالیوں کی گونج میں ان کا استقبال کرتے تھے۔

جیسے ہی کوئی فن کار ڈائس پر آ کر سلام کرتا تو عوام تالیاں بجا کر جیسے کہتے تھے، اچھا تو تم ہو جسے ہم اب تک پڑھتے رہے۔ سنتے رہے اور جس کے بارے میں بات کرتے رہے۔ لیکن تمہیں دیکھنے کا موقع آج ہی ملا ہے۔ اچھا تو تم وہ ہو۔ آؤ ——— آؤ ——— ہمارے سامنے بیٹھ جاؤ ——— ہم تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتے ہیں!

ایک ایک فن کار کے نام پر تالیاں بجتی رہیں!

اور میں سوچتا رہا کہ عوام اور فن کار کا رشتہ کتنا اٹوٹ ہے
فن کار کی عظمت عوام سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں۔ ایسے ادیب اور شاعر
جنہیں عوام کے نام پر ہسٹریائی دورے پڑتے ہیں، سرکس میں تماشہ
دکھانے والے ان مسخروں سے کچھ کم نہیں جو چند لمحوں کے لئے ادبی کرتب
دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں لیکن وہ یہ بات بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارا آرٹ
عوام کے لئے نہیں بلکہ ہماری اندرونی تسکین کے لئے ہے۔ ایسے عوام
دشمن اور انسان دشمن افراد کبھی بھی فن کار نہیں کہلائے جا سکتے۔
سچا فن کار ہمیشہ عوام میں سے آتا ہے۔ عوام کے لئے ہوتا ہے۔
اور عوام ہی کی بات کرتا ہے۔ کیونکہ عوام ہی تو ہر جذبے، ہر احساس اور
ہر خیال کا سرچشمہ ہیں!

دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں شہ نشین ممتاز شخصیتوں سے
بھر گیا۔ ریاستی اور مرکزی وزراء اور گورنر حضرات کے علاوہ ملک کے
تمام اہم ادیب اور شاعر جمع تھے۔ ان میں قابل ذکر پروفیسر احتشام حسین،
کرشن چندر، امریتا پریتم، مسز جے پال۔ پٹا بھی راما راؤ، آمنہ چندیروا،
ٹی وینکٹ رامیا، گیانی گرمکھ سنگھ مسافر، پروفیسر ستیا رامیا،
راماتن سنگھ بہار، شودان سنگھ چوہان (یوپی) شمیم احمد، سکندر علی وجد،
ساحر لدھیانوی، واجدہ تبسم، سلمیٰ صدیقی، رحمٰن راہی اور چترنجن تھے۔
آج کا اجتماع ایک ادبی اجلاس اور مشاعرے پر مشتمل تھا۔
جناب صدر کا بڑی دیر تک انتظار کیا گیا۔ آخر کب تک انتظار

www.taemeernews.com

کیا جاتا۔ لہٰذا صدر کی غیر حاضری میں ہی جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔
پروفیسر احتشام حسین نے ایک مضمون پڑھا جس میں پچھلے اجلاس کی کارروائی کو پیش کیا گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی صدر کے آمد کی اطلاع ملی سکریٹری نے ایک لمحہ کے لئے جلسہ کی کارروائی منسوخ کر کے عوام سے ان الفاظ میں اپیل کی، آج کے اجلاس کے صدر مرکزی وزیر داخلہ جناب یشونت راؤ چوہان تشریف لائے ہیں۔ دیکھئے دیکھئے وہ جلسہ گاہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ چوہان جی کا پرزور تالیوں کی گونج میں استقبال کیا جائے۔
تالیاں اس وقت تک بجتی رہیں جب تک کہ چوہان جی صدر نشین پر پہنچ کر اپنی نشست پر نہ بیٹھ گئے۔

چوہان جی کے سامنے مختصراً یہ رپورٹ پیش کی گئی کہ اب تک اردو کے تعلق سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ اور انہیں بتایا گیا کہ اردو کنونشن اردو جدوجہد کے لئے ایک نیا موڑ ہے۔

اس ادبی اجلاس میں کئی ادیبوں اور شاعروں نے بڑی عمدہ تقریریں کیں خصوصیت کے ساتھ شودان سنگھ چوہان، مسز چوہان، ٹی وینکٹ رامیا، پروفیسر ستیہ رمیا، شمیم احمد شمیم، امریتا پریتم اور چترنجن کے بے باک لب ولہجہ کو بے حد پسند کیا گیا۔

ہندی کے مشہور نقاد شودان سنگھ چوہان (یوپی) نے اپنی تقریر میں صاف صاف کہا کہ اردو کے تعلق سے اب تک بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی رابطہ کی زبان ماننی چاہیئے۔

www.taemeernews.com

یو پی کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے سہ لسانی فارمولے کا ذکر کیا اور کہا کہ سنسکرت کو اس فارمولے میں شامل کیا گیا ہے جو بڑی بے ایمانی کی بات ہے۔ کیونکہ یہ زبان مرچکی ہے۔ اس کی بجائے اُردو کو اس فارمولے میں شامل کرنا چاہیئے۔ بہار، دہلی، پنجاب اور یوپی کے علاوہ جہاں جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں بھی اردو کو ترقی کرنے کا اور آگے بڑھنے کا حق ہے۔ میرے خیال میں اردو والوں نے بہت کم مانگیں پیش کی ہیں۔ اردو اور ہندی کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ صرف چند فرقہ پرست اسے ہوا دے رہے ہیں۔

مسز چوہان کل شام کے اجلاس کو مخاطب کر چکی تھیں۔ انہوں نے بڑے شاعرانہ انداز میں زبانوں کو پھولوں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ کسی باغ میں قسم قسم کے پھول اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں اگر ایک ہی پھول ہر طرف نظر آئے تو ظاہر ہے اس سے خوشی نہیں ہوگی۔ یہی حال زبانوں کا ہے۔ اُردو بھی ہمارے ملک کے باغ کا ایک مہکتا ہوا پھول ہے کیا ہم صرف چند فرقہ پرستوں کو خوش کرنے کے لئے اس پھول کو اپنے اپنے باغ سے نکال دیں!

لوگوں نے ایک منٹ تک تالیاں بجائیں جس کا مطلب تھا کہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ اُردو بے شک ایک مہکتا ہوا پھول ہے!

تلگو زبان کے ممتاز ادیب، شاعر، نقاد اور ادبی ماہنامہ

www.taemeernews.com

"ابھی ویا کے ایڈیٹر شری ٹی۔ وینکٹ رامیا نے کہا' میں آندھرا پردیش سے آیا ہوں اور اردو کنونشن میں اس لیے شریک ہو رہا ہوں کہ اردو میری جنم بھومی میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور میرے وطن کے لاکھوں بھائیوں کی یہ زبان ہے۔ تلگو اور اردو میں کوئی بیر نہیں ہے۔ اردو ہمارے صوبے کی ایک مقبول زبان ہے۔ دوسرے صوبوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن میں اپنے صوبے کے بارے کہہ سکتا ہوں کہ تلگو کے بعد قانونی طور پر دوسرا درجہ اردو ہی کو حاصل ہے۔ غالب کو ہم پسند کرتے ہیں اور تلگو رائٹرس بڑے شوق سے اُردو لکھتے ہیں۔

کنڑا زبان کے شاعر، نقاد اور میسور یونیورسٹی کے وظیفہ یاب پروفیسر سیتیہ رامیا نے کہا کہ اُردو والوں کا مطالبہ حق بجانب ہے۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اسے اس کا حق ملے۔ کیونکہ اردو ایک خوبصورت زبان ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہر صحیح الدماغ انسان اُردو سے محبت کرتا ہے۔

کشمیر کے صحافی اور ایڈیٹر آئینہ جناب شمیم احمد شمیم نے وزیر اعظم کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے بڑے پُرجوش انداز میں کہا' جناب صدر! مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ اُردو بولنے والوں کے آنسو بھی پونچھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ میں کشمیر سے آیا ہوں۔ اور میری مادری زبان کشمیری ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اُردو کو اس کا اپنا مقام دیا ہے۔ ہمارے یہاں ذریعہ تعلیم

www.taemeernews.com

اردو ہی ہے۔ یونیورسٹی سطح پر بھی ہم نے اردو کو اپنایا۔ میں عرض کروں کہ یہاں آپ نے جن جن قدروں کو ٹھکرایا ہے وہاں ہم نے انہیں اپنے سینے سے لگایا ہے۔ اردو والوں کو اپنی وزیر اعظم سے کتنی امیدیں تھیں میں نہیں جانتا ان کی اپنی آخر کیا مجبوریاں تھیں! اگر کوئی ایسی مجبوری تھی بھی تو وہ وعدہ نہ کرتیں۔ اور نہ ہم نے ان سے کسی وعدے کے لئے اصرار کیا تھا۔ وہ اتنا تو کہہ سکتی تھیں کہ میں آپ کے مطالبے پر ہمدردانہ غور کرونگی صرف یہی ایک لفظ ہم لوگوں کے لئے کافی تھا اور ہم اردو والے اس بات پر خوش ہو جاتے اور اپنی دانست میں یہ سمجھتے کہ وزیر اعظم نے کم از کم اتنا اتنا تو کہا۔ لیکن جناب صدر مجھے دکھ ہے کہ ــــــ

پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ برلا ہال نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اور دفعتاً ذہن میں وزیر اعظم کی تقریر گونجنے لگی!

رات کی خاموشی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہلکی ہلکی سردی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن شمیم احمد شمیم کی جوشیلی تقریر سے جیسے ایک برقی لہر دوڑ گئی!

اس وقت سب نے دیکھا جناب صدر کے چہرے پر ایک خوشگوار مسکراہٹ ہے!

پنجابی زبان کی مشہور ادیبہ امریتا پریتم نے بڑے شاعرانہ انداز میں اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ اور کہا "اردو اور پنجابی کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اردو کنونشن میں شرکت کا جب میں نے فیصلہ کیا اس وقت میرے ذہن میں ایک مغربی شاعر کی نظم تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس نظم کو سنا کر آپ کو بھی

www.taemeernews.com

اپنے احساس کا حصہ دار بنالوں۔ نظم مجھے لفظ بہ لفظ یاد تو نہیں۔ لیکن نظم کے مفہوم اور شاعر کے خیال کو پیش کرنے کی کوشش کروں گی۔

ایک ثانیے کے لئے امریتا پریتم خاموش ہو گئیں۔ اور پھر اپنی پیشانی پر جھولتی ہوئی بالوں کی لٹ کو سر کا کر جیسے خلاؤں میں انہوں نے دیکھا اور پھر کہانی سنانے کے انداز میں بولیں، جنگ کی تباہیوں کا پس منظر ہے۔ ہر طرف موت کی خاموشی اور سناٹا ہے۔ اور ایک سپاہی اپنے گھر اور اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور پڑا ہوا سوچ رہا ہے کہ کس طرح اپنے وطن پہنچے۔ اپنی بیوی اور بچوں سے ملے۔ لیکن جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ نہ ٹرین ہے نہ موٹر کار اور نہ بس۔ اور نہ کوئی سواری۔ اور کسی سواری کے بغیر گھر پہنچنا ناممکن ہے لیکن گھر تو جانا ہی پڑیگا۔ کیونکہ اسے اپنے بچوں اور بیوی کی یاد ستا رہی ہے۔ وہ اب یہاں تنہا نہیں رہ سکتا۔ لیکن سوال تو یہی تھا کہ گھر کیسے پہنچے۔ آخر کیسے!

سپاہی سوچتا جاتا ہے۔ پھر اچانک اس کے چہرے پر خوشی کی ایک کرن چمک اٹھتی ہے۔ وہ ایک نئے حوصلے کے ساتھ اٹھتا ہے اور خود اپنے آپ سے کہتا ہے کہ میں سینکڑوں میل کا راستہ طے کروں گا۔ مگر کیا وہ چلتے چلتے بور نہیں ہو جائے گا؟ اس نے سوچا۔ اور ساتھ ہی دوسرے خیال کی لہر ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے راستے کا پتھر بن جاتی ہے۔ تب وہ سینکڑوں میل راستے کی تقسیم کچھ اس طرح کرتا ہے کہ میں دس قدم چلوں گا۔ اپنی ماں کی یاد میں جس نے مجھے دودھ پلایا۔ دس قدم اس شفقت اور محبت کی یاد میں جو مجھے اپنے باپ سے حاصل رہی۔ دس قدم اپنی اس بہن کی یاد میں جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اور جو ایک دن اچانک

www.taemeernews.com

ہم سب کو ہمیشہ کے لئے روتا ہوا چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی۔ دس قدم اس بزرگ استاد کی یادیں جس نے مجھے لکھنا پڑھنا سکھایا۔ دس قدم اس دوست کی یادیں جو مجھے بے حد عزیز تھا۔ دس قدم اپنی محبوبہ کی یادیں، بیوی کی یادیں، بڑی لڑکی کی یادیں، لڑکے کی یادیں، محلے کی یادیں، پڑوسی کی یادیں، گھر کی یادیں، چاندنی اور اندھیری راتوں کی یادیں، بہار اور خزاں کی یادیں، اور زندگی کی ایک ایک بات کی یادیں دس قدم ——— دس قدم ——— صرف دس قدم!!

اس طرح وہ سپاہی سینکڑوں میل کی مسافت طے کرتا ہوا اپنے وطن پہنچ جاتا ہے۔ گھر پہنچ جاتا ہے۔ بالکل اس سپاہی کی طرح میں بھی چاہتی ہوں کہ دس قدم چلوں ——— دس قدم اردو کے لئے!

ایک منٹ تک تالیاں بجتی رہیں!

بھوج پوری شاعر چترنجن نے کہا، میں اردو والوں کے درد کو سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ درد مشترک ہے۔ میری زبان کے ساتھ بھی ناانصافی ہوئی ہے۔ بھوج پوری اور اردو کی لڑائی ایک ہی ہے۔ اس لئے میں اردو کے مطالبے کی پرزور تائید کرتا ہوں۔ ویسے میں اردو لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہار جاکر اردو سیکھوں گا اور اردو کی خاطر شہید ہونے کے لئے ہمیشہ تیار رہوں گا!

شہید ہونے کی بات پر عوام نے بے ساختہ تالیوں کی گونج میں

www.taemeernews.com

بھوج پوری شاعر چتر نجن کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا!

آخر میں مرکزی وزیر داخلہ جناب الیشونت راؤ چوہان مسکراتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کشمیری صحافی شمیم احمد شمیم کی تقریر کا انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا، وزیر اعظم بھی اُردو سے اتنی ہی محبت کرتی ہیں جتنی آپ۔ وزیر اعظم نے آپ سے کچھ وعدہ نہیں کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کچھ کرنا نہیں چاہتیں۔ سمجھ لیجئے کہ وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی ہیں مگر آپ سے کہنا نہیں چاہتیں۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے جناب صدر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا اُردو کے لئے میں وہ سب کچھ کروں گا جتنا میں اپنی زبان کے لئے کرسکتا ہوں۔

آج صبح کے اجلاس میں وزیر اعظم کی تقریر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کچھ ایسی ہی کوشش جناب فخرالدین علی احمد صاحب کی طرف سے ہوئی تھی معلوم نہیں ان دونوں مرکزی وزیروں میں سے کسی نے وزیر اعظم کی تقریر کی صحیح تشریح کی تھی!

ادبی اجلاس کے فوری بعد ساحر لدھیانوی کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ لیکن ادبی اجلاس کی فضا بڑی دیر تک مشاعرے پر چھائی رہی اس مشاعرہ میں شہر اور بیرون شہر کے چند مہمان شعراء نے اپنا کلام سنایا اور عوام سے داد حاصل کی۔ آخر کار یہ محفل رات کے کوئی ایک بجے

www.taemeernews.com

اختتام کو پہنچی۔

مشاعرے کے بعد جیسے ہی میں سڑک پر آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ رات بڑی سرد ہے۔ اور ساتھ ہی میرا ہاتھ غیر شعوری طور پر جیب میں چلا گیا۔ اور سگریٹ کو تلاش کرنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی اس بھول کا احساس ہوا کہ سگریٹ کا اسٹاک تو کبھی کا ختم ہو چکا۔ پھر میری نظریں دور دور تک کسی کھلی ہوئی دکان کے لئے بھٹکنے لگیں لیکن چاروں طرف گہرا اور سنسناتا ہوا سناٹا تھا۔ سرد لہریں جسم میں سوئیاں بن کر چبھ رہی تھیں۔ اور رات جیسے ٹھہر ٹھہر کر گذر رہی تھی۔

شیفرروڈ سے ابراہیم رحمت اللہ روڈ تک راستہ جیسے تیسے طے ہو گیا مگر سگریٹ کی کمی کا بار بار احساس ہو رہا تھا۔ جیسے سگریٹ کے بغیر نہ نیند ہی آسکتی ہے اور نہ اس کپکپاہٹ پیدا کرنے والی ٹھنڈی رات کو ٹالا جا سکتا ہے۔ لیکن سگریٹ آخر کہاں ملیں!

اسلامیہ کالج تک جیسے ایک ہی سوال ذہن میں گھوم رہا تھا۔

وہیں پاس ہی احمد جلیس اور اظہر افسر مل گئے۔ انہیں دیکھتے ہی جی خوش ہو گیا کہ چلو سگریٹ کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی اس خیال نے رہی سہی خوشی کو ختم کر دیا کہ یہ حضرات سگریٹ پیتے ہی کہاں ہیں!

لیکن سگریٹ کے بغیر یہ لکھتے پڑھتے کیسے ہیں! میں نے سوچا اور ساتھ ہی مجھے اپنے اس خیال پر ہنسی آگئی۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے شراب کے بغیر اچھی شاعری ممکن نہیں۔ بھلا اس خیال کا کوئی جواب ہو سکتا

www.taemeernews.com

سے بہ عادت کو اس حد تک مسلط کر لیا کہ آدمی اس کے بغیر بیکار ہو جائے۔
ظاہر ہے کہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں۔ لیکن ـــ لیکن اس سردی کا کیا کیا جائے ـــ توبہ!

پھر سردرات نے ہمیں اکسایا۔ اور سوچا کہ چائے پی جائے۔
چائے کی خواہش ہماری اپنی خواہش نہیں تھی۔ بلکہ سرد رات کا ایک مطالبہ جسے پورا کرنے کے لئے ہم ہوٹل کی تلاش میں نکلے۔
ہمارے ساتھ دو اور دہلی گیٹ تھے۔ اس طرح جملہ پانچ افراد پر مشتمل ایک جماعت آدھی رات کو چائے کی بے پناہ خواہش کو لئے سڑکوں پر آوارہ گھومنے لگی۔ لیکن ہر ہوٹل بند تھی۔ اور ہر سگریٹ کی دکان مقفل!
سنا تھا کہ بمبئی رات میں جاگتی ہے۔ اور دن میں سوتی ہے۔ لیکن سنی سنائی باتیں غلط معلوم ہو رہی تھیں۔ بمبئی اگر رات میں جاگتی بھی ہے تو شاید کسی تاج محل ہوٹل میں یا کسی کلب کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں۔
عام آدمی کی زندگی میں تو بمبئی دن میں بھی سوتی ہے اور رات میں بھی!
ناکام گھوم گھام کر پھر ہم اسلامیہ کالج کے قریب آ گئے۔
کالج کی گیٹ کے سامنے ہی لگی ہوئی کچھ دکانیں تھیں۔ ان میں ایک ہوٹل بھی تھی۔ ہوٹل میں روشنی تھی۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے ہوٹل کھلی ہے۔ لیکن قریب جانے پر پتہ چلا کہ ہوٹل بند ہے اور کھلی بھی۔ بند ان معنوں میں کہ ہوٹل پر موت کی خاموشی طاری تھی۔ کاروبار معطل تھا۔ کھلی ان معنوں میں کہ ہوٹل کا صدر دروازہ ادھ کھلا تھا۔ سامنوں کے پیچھے ہوٹل کی ہر شے واضح طور پہ نظر آ رہی تھی۔ کرسیاں الٹ کر میز پہ رکھ دی گئی تھیں۔ فرش پر ٹاٹ کا بستر لگا ہوا تھا۔ اور اس بستر پہ ہوٹل کے چار پانچ چھوکرے آڑے ترچھے

www.taemeernews.com

پڑے ہوئے خراٹے بھر رہے تھے۔ ایک بھاری بھرکم معمر شخص جو ہوٹل کا پروپرائٹر معلوم ہوتا تھا بڑی میز پر پاؤں پھیلائے لیٹا ہوا جمائیاں لے رہا تھا!

قدموں کی آہٹ اور باتوں کی آواز سن کر اس نے ہماری طرف دیکھا۔ اشارے سے جب ہم نے اسے اپنی طرف بلایا تو اس کے چہرے پر بڑی ناگوار کیفیت پیدا ہوئی اور اپنی مرضی کے خلاف اٹھ کر وہ قریب آیا۔ اور بولا کیا ہے ؟

لہجے میں سختی تھی اور ایک ہلکی سی ڈانٹ بھی جیسے کہہ رہا ہو کون ہو تم ! اتنی رات گئے کیا کام ہے؟

چائے کی بات پر اس نے یوں دیکھا جیسے وہ ہماری شرافت پر شبہ کر رہا ہو۔ اور ہم سے پوچھ رہا ہو کہ کیا تم نہیں جانتے کہ ہوٹلیں اتنی رات گئے تک بمبئی میں کھلی نہیں رہتیں!

اسے جب یہ بتایا گیا کہ ہم حیدرآباد سے اور دوسرے شہروں سے اردو کنونشن میں شرکت کی غرض سے آئے ہیں تو ایک لمحے کے لئے اس نے ہمیں غور سے دیکھا جیسے وہ ہمارے چہروں پر اس صداقت کو پڑھنا چاہتا ہو جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا۔ جیسے وہ ہمیں ٹٹول رہا ہو۔ ظاہر ہے اس کا انداز ہ بڑا چبھتا ہوا تھا اور ہم سب نے اسے محسوس کیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ہم نے دیکھا کہ وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہوٹل کا دروازہ کھول رہا ہے۔۔ دل کا دروازہ کھول رہا ہے :

اب ہمارے سامنے سگریٹ کے پاکٹ اور گرم گرم چائے

www.taemeernews.com

کی پیالیاں تھیں !

اور ہماری خدمت میں وہ معمر شخص پانچ چھ چھوکروں کے ساتھ یوں دست بستہ کھڑا تھا جیسے کسی بادشاہ کے دربار میں خدام کھڑے رہتے ہیں۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ اردو کنونشن کے ذکر کے ساتھ ہی اس معمر شخص کے لہجے اور رویے میں بڑی تبدیلی آئی ہے اور وہ بڑی مہربانی سے پیش آ رہا ہے !

ایک بات پوچھوں صاحب
معمر شخص کے لہجے میں درخواست تھی۔
ضرور پوچھو !
چائے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے کہا۔
کچھ بات بنی صاحب ؟
کیا بات ——— ؟

انجان بنتے ہوئے میں نے پوچھا۔

میرے استفسار پر وہ جیسے چونکا۔ اور پھر بڑے رازدارانہ انداز میں اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا، کیا اردو کی منظوری ہو گئی ؟
ہوٹل کے بیرے یا منیجر کا سوال بڑا ہی معصوم اور صاف سیدھا تھا۔ لیکن جواب اتنا ہی مشکل اور پیچیدہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہا جائے۔ اس کے اس غیر متوقع سوال نے سب کو سنجیدہ بنا دیا !

یہی بات کل مجھ سے بدن خاں نے پوچھی تھی جس کی وکٹوریہ میں بیٹھ کر میں اسٹیشن سے یہاں تک آیا۔ فرق اتنا ہے کہ ایک نے آنے والے

www.taemeernews.com

لمحے کے بارے میں پوچھا تھا اور دوسرے نے گذرے ہوئے لمحے کے بارے میں۔ بڈن خاں کا چہرہ جیسے ہی میرے ذہن کے اسکرین پر چمکا ہے مجھے سائنس کالج ناندیڑ کے وہ طلباء یاد آگئے جنہوں نے مجھے اسٹیشن پر خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی بیباک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ لیکن جن کے چہروں پر یہی سوالیہ تحریر تھی۔ اور جو میر اور غالب کو پڑھنا چاہتے تھے اور جنہیں اقبال عزیز تھا۔ یہی بات زیدی کے لڑکے نے اور ان سینکڑوں لوگوں نے پوچھی تھی۔ جن کا کوئی نام نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو زمانے کی پیشانی پر اپنا نام کندہ کئے بغیر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ خاموش خاموش اور کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کب آئے تھے۔ اور کب گئے۔ لیکن زمانے کی ساری شورشیں اور ہنگامے ان ہی کے دم سے اور ان ہی کے نام سے عبارت ہیں!

کل میں نے بڈن خاں کو اور سائنس کالج ناندیڑ کے طلباء کو مایوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں پُر امید تھا اور مجھے آج کا انتظار تھا۔ لیکن آج آیا اور گذر گیا۔ اور اپنے پیچھے محرومیوں اور مایوسیوں کی ایک کھسک اور چبھن چھوڑ گیا۔ کل اور آج میں کتنا بڑا فرق ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا ـــــ کیا ہوگا؟

زیدی صاحب خاموش ہیں۔ ان کا لڑکا چپ ہے۔ میری لڑکی کچھ بھی نہیں جانتی۔ ہپی لڑکی ٹانگیں پھیلائے ریت پر چت پڑی ہے۔ پہاڑی عورت چیخ رہی ہے۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی ہے۔ اور سمندر کی لہروں کا شور بڑھتا ہی جارہا ہے!

لیکن ہوٹل کا یہ پروپرائٹر مجھے کیوں گھور رہا ہے! میری طرح کیا

www.taemeernews.com

اس کے کانوں میں بھی سیٹیاں بج رہی ہیں!

بھئی احمد جلیس اور اظہر افسر تم ہی اس سے کچھ کیوں نہیں کہتے۔ لیکن تم سب خاموش ہو۔ آخر ہوٹل کے اس پروپرائٹر سے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک لمحے تک ہوٹل میں بڑی عجیب و غریب فضا رہی۔ آخر میں میں نے کہا' بھائی منظوری و نظوری کچھ نہیں ہوئی۔ اُردو پہلے جہاں بھی اب بھی وہیں ہے۔

اظہر افسر نے انگریزی زبان میں مجھے ٹوکتے ہوئے کہا کہ ہمیں ایسی ویسی بات نہیں کہنی چاہیے جس سے مایوسی پیدا ہو۔

پھر میں نے اظہر کو سمجھایا کہ اصل بات کو چھپا کر ہمیں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جس کا صداقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ اور پھر ایسی رجائیت ایک دھوکے سے کم نہیں جو سچائی کے چہرے کو مسخ کردے۔ اس سے زیادہ کسی المیے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بے گناہ مارے جانے والے کو یہ نہ بتایا جائے کہ اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے۔ اور کہاں ہے!

مائی ڈیر اظہر افسر اب ہمیں یہ بات اس ہوٹل کے پروپرائٹر یا منیجر سے صاف صاف نہیں کہنی ہے بلکہ ہر اس شخص سے کہنی ہے جہاں جہاں ہم جائیں گے۔ اور ہر اس بچے بڑے، مرد، عورت کو واضح الفاظ میں یہ بتانا ہوگا کہ اس کی زبان اردو کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے۔ اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہمیں اپنا نام غداروں کی فہرست میں لکھنا ہوگا۔ غدار اردو اور اردو بولنے والے عوام کے۔ اور

www.taemeernews.com

تم جانتے ہو غدار ہر جگہ ہیں۔ قدم قدم پر۔ اور تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرتی!

البتہ ایک کام ہم کر سکتے ہیں۔ اور وہ کام ہمیں کرنا ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اردو بولنے والے عوام کو یہ بات ذہن نشین کرانی ہوگی کہ اب اُردو کے لئے جو کچھ بھی ہوگا ان کی طرف سے ہوگا۔ لہٰذا انہیں آپس میں متحد ہونا چاہیئے۔ اپنے سارے اختلافات کو بھلا کر۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ملا کر آگے بڑھنا ہوگا۔ ــــــ

ہوٹل کے پروپرائٹر کا منہ جیسے ٹنگ گیا!

دوسرے چھوکرے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے!

اور مسرت کی وہ چمک جو ان کے چہروں پر تھی یکلخت غائب ہوگئی۔

اظہر افسر اور احمد جلیس اور دوسرے احباب نے یوں محسوس کیا جیسے میں اس معصوم مسکراہٹ کا قاتل ہوں جو ان کی اور سینکڑوں زندگیوں کو ایک بے نام سی مسرت عطا کرتی تھی!

لیکن میں اپنی دانست میں مطمئن تھا۔ اس سے کم از کم ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ وہ آسمان سے گر کر زمین پر آگئے۔ اور انھیں اپنی صحیح حالت کا پتہ چل گیا کہ وہ کہاں تھے اور کہاں ہیں۔ اور انہیں کیا کرنا چاہیئے بددلی یا مایوسی دلوں میں پیدا ہوتی ہے تو ہونے دو۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، شدید مایوسی خود اپنی ذات اور ماحول کے خلاف دل میں نفرت پیدا کرے گی۔ اور جب کوئی خود اپنے سے خفا ہو جائے، ناراض ہو جائے تو یقیناً تبدیلی کا وہ بے پناہ جذبہ پیدا ہوگا جو کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنی راہ آپ نکالے گا، اور کوئی خارجی قوت، رکاوٹ کا باعث نہیں بن سکیگی۔

www.taemeernews.com

ڈسمبر کی سرد اور ٹھٹھرا دینے والی رات کسی بے رحم سود خوار کی طرح ایک ایک پائی وصول کر کے جسم میں دوڑتے ہوئے گرم گرم خون کو منجمد کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ آخری سانس ہے جو جا کر واپس نہیں آئے گی۔ سامنے کی سڑک کسی بھکارن کی طرح چیتھڑے لگائے ہوئے برہنہ پڑی تھی۔ کہیں زندگی نہیں۔ کہیں ہلچل نہیں۔ کہیں شور نہیں چاروں طرف موت کا ایک سناٹا تھا۔ اور چھائی ہوئی گہری تاریکی!

سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے!

اب بھلا کس موضوع پر بات ہو سکتی ہے کیونکہ ہر شے جیسے ختم ہو چکی تھی!

اٹھتے ہوئے میں نے کہا، اچھا بھائی ہمیں معاف کرنا، اتنی رات میں آپ سب کو تکلیف دی۔ پھر ایک بیرے کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا، بل لاؤ۔

بیرا چپ تھا!

جب میں نے پھر اسی بات کو دہرایا تو ہوٹل کے پروپرائٹر نے پوچھا۔ کس چیز کا بل صاحب ——

میں نے کہا، بھئی کمال ہے۔ اس چیز کا بل جس کے لئے آپ کو ہم نے پریشان کیا۔ سگریٹ اور پان کا ——

ہوٹل کے پروپرائٹر نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا نہیں صاحب بل نہیں آئے گا۔ یہ ہمارے بزنس کا وقت نہیں ہے ——

وہ تو ٹھیک ہے بھائی۔ لیکن ہم نے ہوٹل کھلوا کر چائے پی

www.taemeernews.com

پان کھائے۔ اور یہ سگریٹ کے پیاکٹ جو ہم لگاتار پھونک رہے ہیں۔ ان سب کا کیا ہوگا؟

میری پریشانی دیکھ کر ہوٹل کا مالک ایک بار پھر مسکرایا۔ اور اس نے کہا، صاحب یہ بات آپ کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ صرف اردو کمیٹی کے مہمان نہیں بلکہ ہمارے بھی مہمان ہیں۔ پوری بمبئی کے مہمان ہیں۔ ہوٹل کے پروپرائٹر کی مسکراہٹ بڑی واضح تھی۔ اس میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔

مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی، صاحب آپ لوگ بڑے آدمی ہیں۔ ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو ہمیں معاف کردو۔ ہم پڑھے لکھے نہیں۔ ہم بڑی بڑی باتوں کو نہیں سمجھتے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ایک پیالی چائے میں کتنے چمچ چینی ملانی چاہیے۔ یا فرائی مٹن میں کتنی مرچ ضروری ہے۔ بڑی بڑی باتیں تو آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے صاحب جیسے بھی ہو، جس طرح بھی ممکن ہو اردو کے لئے کچھ کیجئے تاکہ وہ اندھیرا جو ہماری زندگی میں چھایا ہوا ہے ہمارے بچوں کی زندگی میں اجالے سے بدل جائے۔ ہم اپنے بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں۔ قابل بنانا چاہتے ہیں۔ بالکل آپ جیسے۔ تاکہ وہ ہماری طرح علم سے محروم نہ رہیں ورنہ ہماری موجودہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔

صاحب بتائیے ہماری یہ خواہش یا آرزو کہیں غلط تو نہیں۔

ابھی حال حال میں ہم نے ملک کے ایک بڑے لیڈر کی تقریر سنی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ علم کی روشنی اس ملک کے گھر گھر میں جائے گی۔ اور ہر شخص کے بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع حاصل رہے گا

www.taemeernews.com

اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر صاحب یہ ساری گڑبڑ کیوں؟

ہماری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔ بھلا ہم ان قانونی نکتوں کو سمجھ بھی کیا سکتے ہیں۔ جاہل جو ٹھیرے۔ آپ حضرات ہی کچھ کیجئے۔ کچھ سوچئے اور کوئی راستہ نکالئے!

مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی!

ہوٹل کا پروپرائٹر جاہل تھا۔ دستخط کی جگہ وہ اپنا انگوٹھا لگاتا تھا۔ میلا کچیلا۔ بے ڈھنگا سا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میلی کچیلی نہیں تھی۔ صاف۔ نکھری ستھری۔ دھلی دھلائی۔ جیسے کوئی ابھی ابھی غسل کر کے آرہا ہو۔ گیلے بالوں کے ساتھ۔ خدا حافظ کہنے کے لئے جس لمحے اس نے منہ کھولا تو یوں لگا جیسے مسکراہٹ کو وہ دائمی شکل دینا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی ہم سب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی پرخلوص میزبانی کا شکریہ ادا کیا اور مصافحہ کرتے ہوئے گرمجوشی سے ہاتھ دبا کر میں نے جیسے کہا میرے اناڑی دوست فکر مت کرو۔ میں تمہارے اس پیغام کو ایک ایماندار سفیر کی طرح ہر اس شخص تک پہنچاؤں گا جس جس سے میری ملاقات ہے۔ یہی نہیں بلکہ جہاں جہاں میں جاؤنگا تمہارا پیام میرے ساتھ ساتھ جائیگا۔ میں انہیں تمہارے خلوص کی کہانی سناؤں گا۔ اور انہیں بتاؤں گا کہ تم نرے جاہل ہوتے ہوئے بھی کس طرح کسی یونیورسٹی کی ڈگری رکھنے والے تعلیم یافتہ شخص سے زیادہ سمجھدار اور کسی نیتا سے زیادہ متوازن رائے کے مالک ہو۔ تم اور بڈن خاں جیسے سینکڑوں، لاکھوں اور کروڑوں لوگ اپنی زبان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور کس طرح سوچتے ہیں اور اس تعلق سے کیا چاہتے ہیں۔ اس بات کو میں ہر اُس

www.taemeernews.com

شریف اور ایماندار آدمی کے سامنے رکھوں گا جو ایک انسانی نقطۂ نگاہ کا مالک ہے۔ تم انتظار کرو۔ اور دیکھو کہ تمہاری اس مخلص اپیل کا کیا اثر ہوتا ہے!

اسلامیہ کالج پر موت کا سناٹا تھا!

رات آدھی سے زائد گزر چکی تھی۔ اور میں بڑی دیر تک بستر پر پڑا ہوا ہوش اور بے ہوشی کی درمیانی کیفیت کا شکار رہا۔ دن بھر کی سینکڑوں باتیں نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔ وہ بڑا ہال ـــــــ سلاخوں کے پیچھے مقید ٹہلتی ہوئی عورتیں ـــــــ سمندر کا کنارا اور ـــــــ طوفانی لہریں ـــــــ بھی لڑکی، بھکاری عورت، ناریل کی تقسیم ـــــــ اردو کی لڑائی ـــــــ میز، سڑک ـــــــ بڈن خاں ـــــــ ہوٹل، پرعپرائٹر ـــــــ دس قدم ـــــــ دس قدم ـــــــ صرف اُردو کے لئے!

اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے میرا دماغ کسی تیز رفتار گاڑی کا وہ پہیہ ہے جو گھومتے گھومتے دفعتاً ٹھہر جائے گا۔ ہمیشہ کے لئے!

پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی!

تیس ڈسمبر کا سورج جیسے اپنی حرارت اور چمک کھو چکا تھا۔ اکثر مندوبین مایوس اور بددل ہو کر آخری اجلاس میں شرکت کی بجائے بمبئی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ چنانچہ ہوا بھی یہی۔ ہال خالی خالی تھا۔

www.taemeernews.com

دس بج رہے تھے۔ مرہٹی ساہتیہ سنگھ کے ڈاکٹر بھالے راؤ میموریل ہال میں چند افراد بیٹھے نظر آرہے تھے۔ ایک بہت ہی اہم موضوع پر سمپوزیم منعقد کیا گیا تھا۔ عنوان تھا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی میں ادیبوں کا رول ——

دوسرے الفاظ میں ایک فن کار کو قومی یک جہتی کے لئے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خاطر کیا کرنا چاہیئے!

قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بات تو بعد میں آتی ہے۔ پہلا اور بنیادی سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادیب اور فن کار کا سماجی زندگی میں کوئی رول بھی ہوتا ہے؟

افلاطون اور ارسطو سے لے کر آج کے بڑے مفکر تک سب اس خیال پر متفق ہیں کہ ادب اور ادیب زمانے کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ معلم بھی ہوتا ہے۔ وہ بھٹکے ہوئے قافلوں کو راستہ ہی نہیں دکھاتا بلکہ ایک بہتر زندگی کے تصور کو پیش کرتا ہے۔ یہیں سے مصور اور فوٹو گرافر الگ الگ خانوں میں بٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ فوٹو گرافر صرف ان ہی حقیقتوں کو پیش کر دیتا ہے جو نظر آتی ہیں۔ اور مصور اس سے آگے بڑھ کر ان سچائیوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے جو نظر نہیں آتیں۔ بلکہ ذہن، تصور اور روح کے کسی حصے میں ایک کانٹے کی طرح چبھتی رہتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مصور "کیوں" اور "کس لئے" کا جواب بھی دیتا ہے۔ اس طرح ایک ادیب اور فن کار بھی وہ مصور ہے جو زمانے کی روح کو اپنے فن میں سمو لیتا ہے۔

اس خصوص میں مجھے روس کے بڑے ادیب میکسم گورکی کی ایک

www.taemeernews.com

بات یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا۔ ایک سچے فن کار کا رول ایک گورکن اور دایہ کا ہوتا ہے!

اس ایک فقرے میں گورکی نے وہ ساری باتیں کہدیں جسے ایک باشعور فن کار کی مکمل تعریف کہنا چاہیئے۔

اس طرح وہ نام نہاد ادیب، فن کار اور شاعر اپنے اصلی روپ میں نظر آنے لگتے ہیں جو خود کو عوام سے بلند سمجھتے ہیں۔ اور اپنی دانست میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کے آرٹ اور فن کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ علم اور فلسفے کی کئی ذہنی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ منزل آتی ہے جب ان کے فن کی الف، ب کو سمجھا جائے۔ اور ان کے فن کے عرفان کے لئے تو ایک عمر چاہیئے وغیرہ وغیرہ ——

یا وہ خود ساختہ دانشور جو اس بات کی وکالت کرتے ہیں کہ ان کا آرٹ کسی کے لئے نہیں بلکہ خود ان کے اپنے لئے ہے۔ وہ اپنی ذاتی مسرت اور اطمینان کے لئے کسی تخلیقی کارنامے کو انجام دیتے ہیں۔ عوام کا لفظ ایک گمراہ کن لفظ ہے اور وہ اسے ایک بکواس سمجھتے ہیں۔ اس لئے کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کی تخلیق کے بارے میں کوئی سوال کرے۔

یا پھر وہ بہروپیئے قسم کے دانشور جو سرے سے زندگی کی کسی حقیقت اور کسی قدر کو نہیں مانتے بلکہ فلسفیانہ اصطلاحوں کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ دنیا ایک مردہ دنیا ہے۔ یا ایک خواب ہے۔ یہاں اچھائی اور برائی کا سوال اٹھانا ایک بچکانی اور جاہلانہ بات ہے۔ ہر شے اضافی ہے۔ لہٰذا عام دنیوی اصطلاحوں

www.taemeernews.com

کے پیچھے مت بھاگو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نجی زندگی میں یہ ہر اصول کو اپناتے ہیں اور ٹھاٹ سے رہتے ہیں۔

یا پھر وہ عورت زدہ فن کار جو ہر شئے اور ہر مسئلے کو جنسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اور ان کے پاس ہر مرض کا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ ہے جنسی آسودگی۔ باپ، بیٹی، بہن بھائی اور ماں بیٹے کی محبت میں بھی وہ جنسی گھٹن اور بھوک کو پیش کر کے بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ انسانی رشتوں کا احترام ان کے نزدیک ایک قدامت پرستانہ جذبہ ہے جو ایک غیر سائنٹیفک ذہن کی پیداوار ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں عضو تناسل ہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور آرٹ کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ ان کا پیش کردہ انسان اس وحشی انسان سے قطعاً مختلف نہیں جو جنگلوں میں رہا کرتا تھا۔

غرض کئی ایسے ادیب، شاعر اور فن کار ہیں جو اپنی بھٹکی ہوئی زندگی اور ذہن کی ساری گندگیوں کو پیش کر کے اس بات پر مصر ہیں کہ اُسے عصرِ حاضر کا نمائندہ ادب مان لیا جائے۔

لیکن انہیں اتنی فرصت نہیں کہ خدا اور بھگوان کے نام پر خون کی جو ندیاں بہی جاتی ہیں اس پر قلم اٹھائیں۔ یا اس شیطان کو پیش کریں جو اس تباہی کا ذمہ دار ہے۔ اور جس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی یا قومی یک جہتی جیسے بار بار دہرائے ہوئے الفاظ ان کیلئے کسی انسپریشن کا باعث نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قاتل، ڈاکو، زانی، لٹیرے، چور، جاسوس، طوائفیں، دلال اور غنڈے ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ سب اسی حیثیت سے ادب میں

www.taemeernews.com

داخل ہو رہے ہیں۔ خود غرضی خود پرستی، اور خود لذتی کے شکار یہ وہ کردار ہیں جو سماج کے مجرم ہیں اور جن کی ان ادیبوں کے پاس بڑی اہمیت ہے لیکن ان کے یہاں کسی شریف آدمی کی اور انسانی اعلیٰ قدروں کی کوئی اہمیت نہیں!

اگر ان میں سے کوئی فرقہ وارانہ ہم آہنگی جیسے اہم موضوع پر اظہار خیال کر بھی لیتا ہے تو اس کی تان وہی جنسی بے راہ روی پر ٹوٹتی ہے۔ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا واحد علاج وہ جنسی آزادی میں ڈھونڈتا ہے۔ ظاہر ہے یہ وہ نئی بربریت ہے جس کا شکار نئی نسل ہو رہی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ہسٹریائی کیفیت میں ایک انسان دوست فن کار کیا کرے؟

بنیادی طور پر یہ سوال اسی سوال کا ایک جز ہے کہ کیا سماجی زندگی میں کسی ادیب اور فن کار کا کوئی رول بھی ہوتا ہے؟

اس سوال کا جواب بے حد ضروری ہے اور اس کے بغیر تخلیقی ادب کی بات ایک ڈھونگ اور عوامی سطح پر ایک دھوکہ ہے۔ دراصل اس کا جواب ہی فن کاروں اور ادیبوں کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ کر انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ ایک وہ جو ذہنی انتشار اور مایوسی کی فضا پیدا کر کے اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ انسان مر گیا۔ اور دوسرے وہ جو گھپ اندھیرے میں چراغ جلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے دونوں کا نظریاتی تضاد سب کے سامنے ہے۔ اپنی انا کے خول میں بند خود لذتی کے شکار تمام نہاد فنکاروں کو صاف الفاظ میں یہ اعلان کرنا چاہیے کہ وہ جنگ بازوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔

www.taemeernews.com

اور انھیں انسانیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور انسان دوست فن کاروں کا یہی کام ہے کہ وہ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت کریں۔ اور اپنی دور کے اس زوال آمادہ معاشرہ میں انسانی حقوق کی حفاظت کریں۔ حق اور انصاف کی اس لڑائی میں وہ پہلے بھی شریک تھے۔ اور آج بھی شریک ہیں۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ فتح یاب ہو کر تاریخ کے صفحات پر اپنا نام لکھوانا چاہتے ہیں۔ یا چاہتے تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی انا اور ذات سے بلند ہو کر عوام کی طرف سے ان پر عائد کردہ ذمہ داری کو پورا کرنا اپنا ایک فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ آج بھی وہ اس جہاد میں شامل ہیں تاکہ مظلوم، بے بس اور تباہ حال سینکڑوں، لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو ایک نیا حوصلہ ملے۔ اور وہ اس عزم کے ساتھ آگے بڑھیں کہ شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں جیت ان ہی کی ہوگی۔ سچائی کی ہوگی۔ انسان ابھی زندہ ہے۔ خدا مرا نہیں!

دس بج چکے تھے جلسہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ہال کی وہی حالت تھی۔ اور میرے دماغ میں یہ الفاظ جیسے گونج رہے تھے۔ فن — فن کار قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی — اور پھر نہ جانے کیا کیا —

بڑی دیر بعد جلسہ شروع ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت شملہ کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانس ریسرچ کے ڈائریکٹر مسٹر نرنجن نے

www.taemeernews.com

کی اس میں جہاں دوسری زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں نے حصہ لیا وہیں اُردو کے ادیبوں نے بھی۔ حصہ لینے والوں میں ڈاکٹر ملک راج آنند کے علاوہ سجاد ظہیر، حسن نعیم، سلطانہ جعفری، حمیدہ سلطانہ، احمد جلیس اور جوگندر پال قابل ذکر ہیں۔

کشمیر کے نمائندوں کا لہجہ سخت تھا۔ اور وہ جذباتی بہاؤ میں اپنے موضوع سے ہٹ گئے تھے۔ لیکن بنیادی طور پر سب اس بات پر متفق تھے کہ فن کار کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو وہ اس سے بلند ہو کر انسانیت کی بات کرتا ہے اور ذات پات، رنگ نسل، زبان، صوبہ اور مذہب کے ان بتوں کو گراتا ہے جو انسانوں کے بیچ میں کھڑے ہوئے قتل و خون کا خاموش تماشہ دیکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان افراد کو بھی عوام کے سامنے بے نقاب کرتا ہے جو ذاتی فائدہ کے لئے نفرت کی آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فن کار اپنی تخلیقات سے محبت اور دوستی کی فضا پیدا کرتا ہے۔

جلسے سے قطع نظر ایک قابل ذکر بات جو مجھے کہنی تھی وہ میں بھول ہی گیا۔ اس بات سے یقیناً آپ کے سامنے اردو کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ سامنے آئے گا۔ ہوا یوں کہ ابھی جلسہ کی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اور دوسری زبانوں کے دانشور دو دو یا تین تین پر مشتمل گروپ میں مختلف موضوعات پر بات چیت کر رہے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر ملک راج آنند سے بات کرتے ہوئے جب میں نے اپنی ریڈیائی کہانیوں کا مجموعہ "ہم جنم جنم کے ساتھی" ان کی خدمت

www.taemeernews.com

پیش کیا تو وہ فوراً پوچھ بیٹھے۔۔۔۔

بھئی اس کی قیمت ؟

میں نے کہا' یہ ایک تحفہ ہے۔ اور تحفے کی قیمت کیسی ؟

ڈاکٹر ملک راج آنند مسکرائے اور انہوں نے کہا' یہی تو ہم لکھنے پڑھنے والوں کی کمزوری ہے۔ لیکن میں نے ایک اصول بنا لیا ہے کہ کتابیں خرید کر پڑھوں ۔۔۔ اس لئے میں تمہاری کتاب بھی خرید کر پڑھنا چاہتا ہوں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے پھر کہا ۔۔۔

تم کو تو مجھ سے پیسے لینا چاہئے اور جب میں قیمت ادا کرنے کے پوزیشن میں ہوں تو تم کیوں نہیں لیتے !

پھر اس کے بعد جیسے انہوں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا ۔۔۔

مجھے معلوم ہے کہ آج کل اردو کتابیں کتنی چھپتی ہیں۔ اور کتنی بکتی ہیں ۔۔۔ سنو۔ میری بات یاد رکھو۔ کسی کو بھی کتاب مفت مت دو۔ اس سے پیسے لو۔ ہم کو چاہیے کہ بیچنے کے فن کو بھی سیکھیں !

میں نے قیمت بتائی۔ انہوں نے قیمت ادا کی اور میں ابھی شکریہ ادا کرنے بھی نہ پایا تھا کہ انہوں نے کہا ۔۔۔

اب تم اسے خریدو !

ساتھ ہی انھوں نے چار صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ نما چیز میرے ہاتھ میں تھما دی یہ ایک انگریزی زبان میں مختصر سی نظم تھی۔ میں شاعر کا نام بھول رہا ہوں۔ لیکن شاعر نے بڑے خلوص سے ان عوامی قوتوں کی تائید اور حمایت میں اپنی آواز بلند کی تھی جنہیں سرمایہ دارانہ نظام پسپا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

www.taemeernews.com

ان چار اوراق کی قیمت ایک روپیہ تھی!

خوشی خوشی میں نے قیمت ادا کی۔ اور ساتھ ہی ایک سوال ذہن میں ابھرا کہ اگر یہی نظم کسی اردو شاعر کی ہوتی تو کیا لوگ ایک روپئے میں خریدتے ــــ؟

اس کا جواب ہمارے دلوں کے کسی کونے میں چھپا ہوا ہے۔

اور اس کے لئے خود ہمیں اپنے آپ کو ٹٹولنا ہوگا!

میں نے دیکھا ڈاکٹر ملک راج آنند پھر مختلف کالجوں کے ان طلبا سے مخاطب ہوئے جو ان کے آٹوگراف کے لئے بے چین کھڑے تھے۔ ڈاکٹر آنند نے کہا کہ آٹوگراف صرف انھیں کو ملے گا جو ان سے انگریزی شاعر کی نظم خریدے۔ یہ شرط بڑی موثر ثابت ہوئی۔ اور دس پندرہ منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر آنند نے وہ ساری کاپیاں بیچ دیں جو بنڈل کی شکل میں ان کے ہاتھ میں تھیں!

واقعی کتابیں بیچنا بھی ایک فن ہے!

میں نے سوچا۔

جاگیردارانہ تہذیب بیچنے کے اس طریقے کو برا سمجھتی رہی ہے۔ تحفے، تحائف اور نذرانے کی روائیت اور مفت خوری اس کی گھٹی میں ہے۔ مجھے یاد ہے آج بھی میرے وطن عزیز میں بعض حلقے کتابیں بیچنے کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھتے ہیں۔ اور خاص طور پر مجھے ایسے کئی لمحوں سے دوچار ہونا پڑا جب پڑھے لکھے حضرات بھی اس بات پر مصر رہتے ہیں کہ انھیں کتاب بطور تحفہ دی جائے۔ کیونکہ ادب بیچنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ مفت تقسیم کرنے کی چیز ہوتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔

www.taemeernews.com

اندازہ لگائیے کہ اُردو بولنے والے پڑھے لکھے حضرات کا رویہ اُردو کتابوں کے تعلق سے کتنا المناک ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اردو کتابیں خریدنا ایک ایسی خیرات ہے جس کا کوئی ثواب نہیں!

آپ کا پبلشر کون ہے۔ اور آپ کو کتنا معاوضہ ملا؟

ڈاکٹر آنند کے اس سوال پر جب میں نے انہیں بتایا کہ میرا پبلشر کوئی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ہے تو وہ عوام ہیں۔ میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ کتاب شائع کرنے سے پہلے رسیدیں چھپوا کر میں پیشگی قیمت وصول کر لیتا ہوں۔ اور اشاعت کے بعد خریداروں کے یہاں کتاب بھیج دیتا ہوں۔ اس طریقے سے گھاٹے کا کوئی اندیشہ رہتا ہے اور نہ منافع کا کوئی لالچ۔ لیکن محنت سخت کرنی پڑتی ہے۔

بڑی توجہ اور دلچسپی سے ڈاکٹر آنند نے میری باتوں کو سنا۔ اور کہا کہ تمہارا یہ طریقہ تو بڑے بڑے پبلشروں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

پھر اس کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ طریقہ نیا نہیں ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں لندن کے ایک انگریز ادیب نے پہلی بار پیشگی قیمت وصول کر کے کتابیں چھپوانے کا طریقہ رائج کیا۔ اسے اپنی کوشش میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اور پھر جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا ادیبوں اور فن کاروں کی قدر ہونے لگی۔ اور پبلشر انہیں معقول معاوضہ دینے لگے۔ لیکن اردو ——— ——— اردو کا معاملہ ہی اور ہے۔

www.taemeernews.com

پھر بھی ـــــ انہوں نے کہا، نوجوان ادیب اور شاعر پیشگی خریداری کے اس طریقے کو اپنا کر زیادہ سے زیادہ کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور اردو پبلشرز کی مونا پلی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے موجودہ صورت میں اسے محض ایک انفرادی کوشش کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہی کوشش بڑے پیمانے پر شروع ہو تو اس سے مفید نتائج نکل سکتے ہیں۔ اور اس طرح عوام کے ہاتھ میں اچھا لٹریچر جائے گا۔ اور لکھنے والے پبلشروں کے محتاج نہیں رہیں گے۔

پہلے تو اردو کے ناشرین کم ہیں۔ اور جو ہیں وہ ایسی کتابیں چھاپتے ہیں جن کے کاروبار کو چمکائے۔ ظاہر ہے ایسا سستا ادب، جاسوسی، رومانی، فلمی، نیم فلمی موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور بڑے بڑے نام نہاد ادبی اداروں سے جو کتابیں شائع ہوتی ہیں انہیں اتنے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے کہ چھپنے چھپنے تک مسودہ کا کاغذ سفید سے بادامی ہو جاتا ہے اور پھر مسودوں کی منظوری میں بھی وہ سارے رشتے ناطے، دوستیاں اور سفارشیں کام کرتی ہیں جو ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہیں۔ اس سے بحث نہیں کی جاتی کہ مسودہ کیسا ہے بلکہ اس پر غور کیا جاتا ہے کہ مسودہ کس کا ہے۔ مسودہ پیش کرنے والا کس کا بہنوئی، کس کا سالا، کس کا دوست اور کس کا خود نظر ہے اور اس کی موجودہ پوزیشن کیا ہے۔ ظاہر ہے ان ہر دو صورتوں میں نقصان اردو کے کاز کو پہنچتا ہے۔ اور نقصان پہنچانے والے کوئی اور نہیں بلکہ خود اردو کی نمائندگی کرنے والے اردو دوست ہیں۔ اب ان کا محاسبہ کون کرے!

ڈاکٹر ملک راج آنند سے گفتگو کرتے ہوئے میرے ذہن میں چند

www.taemeernews.com

اور باتیں ابھریں۔ اور وہ یہ کہ اردو داں طبقے میں کیا وہ شعور پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی انجمنیں قائم کر کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے حق میں اپنا فیصلہ سنائیں۔ فی الوقت میں فیصلے کے لفظ کو واپس لیتا ہوں۔ کیونکہ یہ لفظ تو اسی وقت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب قاری کی ذہنی سطح تنقید اور تجزیہ کی گتھیوں کو سلجھانے کے قابل ہو سکے۔ مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ کیا وہ واضح طور پر اپنی پسند اور ناپسند کا اعلان کر سکتے ہیں!

ظاہر ہے ایسا نہیں کر سکتے۔ اس لئے نہیں کہ ان کے پاس وہ شعور نہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں دانستہ طور پر دور رکھا گیا ہے۔ تاکہ ادب کا سونا پرکھنے والے سناروں کا کاروبار چل سکے۔ اور بازار میں ان کی ساکھ رہے۔ حالانکہ قاری میرا مطلب ہے کہ عام آدمی اور عوام زندگی کا وہ سرچشمہ ہیں جن سے تبدیلی اور ارتقا کا ہر دھارا پھوٹتا ہے!

میری اس اشاعتی اسکیم پر ڈاکٹر صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا اس سے مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے ان کے مشورے سے پورا اتفاق کیا کہ اس اسکیم کو آگے بڑھنا چاہیئے۔ اور وہ اسی طرح ممکن ہے کہ دوسرے ادیب، اور شاعر بھی عوام سے براہ راست ربط پیدا کر کے کتابیں چھاپیں۔ ایک کامیاب تجربہ ہمیشہ نئی نئی راہیں پیدا کرتا ہے لیکن مجھ میں اتنی اخلاقی جرارت پیدا نہ ہو سکی کہ میں کھلے دل کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا کہ میرے ہی وطن عزیز میں اس اسکیم کا منہ کالا ہو گیا ہے ایک بھگل نما ادیب اور شاعر نے رسیدیں چھپوا کر عوام سے کافی رقم حاصل کر کے کتاب

www.taemeernews.com

شائع کی۔ لیکن تمہید میں بجائے شکریہ کے اس بات کا اعلان کیا کہ "عاتق شاہی اسکیم" اس کے لئے خسارہ کا سودا ثابت ہوئی۔ اس کے بعد چند ادیبوں نے اسی طریقے کو اپنایا مگر کتابیں نہیں چھاپیں۔ مطلب یہ کہ عوام کے پیسے کو مال غنیمت سمجھا۔ اور اب اس کا شدید ردعمل عوام کی طرف سے یہ ہوا کہ اگر کوئی ادیب یا شاعر خواہ وہ کتنا ہی ایمان دار اور مخلص کیوں نہ ہو اپنی کتاب کی پیشگی خریدی کے لئے عوام کے پاس جاتا ہے یا اس کے چند نمائندے جاتے ہیں تو عوام ان پر ہنستے ہیں اور ان کی بات سنے بغیر ہی نہیں خدا حافظ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے عوام کے اعتماد کو دھکا پہنچانے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس سے دوسرے لکھنے پڑھنے والوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ دو چار کی غلطی کی سزا دوسروں کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ چنانچہ اب یہ اسکیم پہلے جتنی سکڑی ہوئی تھی اب بھی اسی مقام پر ہے۔ اب اگر عوام کسی رسید پر عاتق شاہ کا نام دیکھکر پیشگی کتاب خرید لیتے ہیں تو صرف یہ ایک فرد پر اعتماد کا اظہار ہوا۔ ضرورت ہے کہ ان کے اعتماد کو جو ٹھیس لگی ہے اسے پھر سے بحال کیا جائے اور بتایا جائے کہ ادیب اور شاعر فرشتے اور پیغمبر نہیں ہوتے کبھی ان سے بھی بھول اور غلطی ہو سکتی ہے۔ جن حضرات نے ایسی حرکت کی ہے اگر آپ انہیں بخش نہیں سکتے تو جانے دیجئے۔ ہم اصرار بھی نہیں کریں گے۔ لیکن جو مخلص ہیں۔ اور کام کرنا چاہتے ہیں انہیں تو موقع دیجئے۔ سب کو ایک ہی عینک سے آپ کیوں دیکھتے ہیں؟

مرہٹی زبان کے ادیبوں اور دانشوروں نے اسی شام

www.taemeernews.com

مرہٹی ساہتیہ سنگھ کی طرف سے اُردو کنونشن میں شریک ہونے والے تمام مندوبین کو ایک پرتکلف عصرانہ دیا
استقبالیہ کمیٹی کے ارکان دروازے کے قریب کھڑے ہوئے ہر آنے والے مندوب کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ان کے پاس تین چیزیں تھیں۔ پہلی چیز پھولوں کا وہ ہار جو ہر آنے والے کے گلے میں ڈال رہے تھے دوسری چیز گلاب کا عرق یا عطر جو ہر ایک کے ہاتھ پر لگا رہے تھے۔ اور تیسری چیز وہ مسکراہٹ جو سب پر نچھاور کر رہے تھے۔ یہ مسکراہٹ بڑی صاف واضح اور روشن تھی۔ اس میں کوئی بھید بھاؤ نہ تھا اور نہ اس میں کوئی سیاسی چال تھی۔ یہ مسکراہٹ ان کے اپنے دلوں کی طرح خوبصورت اور معصوم تھی۔ مسکراہٹ جو ہر ایک سے کہہ رہی تھی۔ آؤ بھائی آؤ۔ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں!
مرہٹی اور اردو زبان کے ادیب ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ گلے مل رہے تھے۔ اور اس مشترکہ تہذیب اور کلچر کو سنوارنے کی بات کر رہے تھے جس کے ہم سب وارث ہیں۔
اور مرہٹی کے مشہور اسکالر ستیو ما دھو راؤ صاحب ہر ایک سے پوچھتے پھر رہے تھے۔ بھئی آپ نے چائے پی!
آپ نے بسکٹ لئے!!
اور آپ ——— آپ ——— !!!
ستیو ما دھو راؤ وہی ہیں جنہوں نے غالب کے کلام کا مرہٹی میں ترجمہ کیا۔ اور غالب اب اردو اور مرہٹی زبان کی ایک مشترک قدر ہے۔ غالب کو کسی بھی زبان میں پڑھو۔ اس کی انسان دوستی کا قائل ہونا پڑتا

www.taemeernews.com

ہے بھلا غالب کو چاہنے والے غالب کی زبان اُردو سے کیسے نفرت کر سکتے ہیں!

اردو مرہٹی، ہندی اور دوسری زبانوں کے ادیب بھی اس عصرانے میں شریک تھے۔ دوستی اور پیار کی ایک زبان نہیں ہوتی۔ اس تقریب میں وہ سارے جانے پہچانے نئے اور پرانے چہرے نظر آ رہے تھے جو ۲۸ نومبر سے لے کر ۳۰ ڈسمبر تک اردو کنونشن کی طرف سے منعقدہ تمام جلسوں میں دیکھے گئے۔ پنڈت آنند نرائن ملا سے لے کر یوسف ناظم اور عزیز قیسی تک اس عصرانے میں شریک تھے۔ سب ہنس بول رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ اور مرہٹی کے میزبان ادیب اپنے مہمانوں کی خاطر میں لگے ہوئے تھے۔

پھولوں اور عطر کی خوشبو سے سارا ہال مہک اٹھا تھا!

واقعی وہ شام بڑی سہانی تھی۔ مرہٹی بولنے والے دوستوں کا وہ خلوص اور پیار اُردو بولنے والے کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ ایک زبان کے بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں کا دوسری زبان کے لکھنے پڑھنے والوں کو اس طرح گلے لگانا کیا اس بات کی تصدیق نہیں کہ دانشور خواہ کسی زبان کے ہوں انسان دوستی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ مرہٹی کے کسی ادیب نے اردو کنونشن کے کسی جلسے کے بارے میں اظہار خیال کیا اور نہ کسی نے اسے موضوع بحث بنانے کی کوشش کی۔ سب خاموش تھے۔ لیکن وہ اپنی خاموش زبان میں جیسے کہہ رہے تھے، میرے بھائی تم سب ایک زندہ اور عظیم زبان کے ادیب، شاعر اور دانشور ہو۔ اس لئے ہم تمہیں اور تمہاری عظیم زبان اُردو کو سلام کرتے ہیں جس نے

www.taemeernews.com

بیرونی ممالک کو ملانے کے لئے ایک پُل کا کام کیا۔ اور جس کے گیت اور جس کی غزلیں ہندوستان کے ہر شہر اور ہر صوبے کے کسی نہ کسی گلی کوچے میں گنگنائی جاتی ہیں۔ تمہاری زبان کی شاعری میں رس ہے۔ یہ رس ہمیشہ دلوں سے نفرت اور کدورت کو دھوتا رہے گا۔ یہ صحیح ہے کہ آج تمہاری زبان کی ترقی میں چند رکاوٹیں ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ تم سب مل کر ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ لیکن یہ کیوں بھولتے ہو کہ ناکامی ہی کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ کیونکہ ناکامی ہی آدمی کی تمام سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کر کے باعمل کر دیتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ کل سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی تم سب اپنے اپنے شہروں اور صوبوں کو چلے جاؤ گے۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ وہاں جانے کے بعد، اپنے لوگوں میں، عوام میں پہنچنے کے بعد تم کیا کرو گے۔ کیا سوچو گے۔ اور کیسے اپنی زبان کے کام کو آگے بڑھاؤ گے۔ اور نہ ہم تمہیں کوئی مشورہ دے سکتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ کسی کے مشورہ سے زبان کی تقدیر بنتی اور بگڑتی نہیں۔ یہ کام تمہیں اور تمہارے عوام کو کرنا ہوگا۔ البتہ ہماری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ اس لئے دوستو خدا حافظ ——— خدا حافظ ——— خدا حافظ !!

اردو کنونشن میں شریک ہونے والے سارے مندوبین اپنا سامانِ سفر باندھ رہے تھے۔ کوئی صبح کی ٹرین سے جا رہا تھا۔ اور کوئی شام کی میز کی نشست محفوظ ہو چکی تھی اور ٹرین کا وقت تھا ایک بجے ———

www.taemeernews.com

سید محمد زیدی، سکریٹری اردو کمیٹی نے میرا ٹکٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا، بھائی آپ کو خدا حافظ کہنے کے لئے اسٹیشن آتا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

یہ حقیقت بھی تھی۔ سید محمد زیدی اور ان کے ساتھی شیام نگم، پروفیسر ذاکر حسین، اسلامیہ مہاراشٹرا کالج کے اساتذہ اور طالب علم، مشہور ماہنامہ شاعر کے ایڈیٹر اعجاز صدیقی، سردار جعفری، کرشن چندر اور کئی احباب اس کنونشن کے سلسلے میں رات دن مصروف رہے۔ ان کی مخلصانہ کوششوں کا اعتراف ہر اردو بولنے والے کا ایک فرض ہے۔

سید محمد زیدی سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے کہا کوئی بات نہیں۔ آپ اُردو کمیٹی کے ارکان ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اتنے بڑے پیمانے پر کنونشن کا منعقد کیا۔ اور قومی سطح پر نہ صرف اپنے وجود کا ثبوت دیا بلکہ دوسری زبانوں کے دانشوروں کو اپنی تائید میں لا کھڑا کیا۔ سچ تو یہ کنونشن مستقبل میں ہونے والے کسی بھی اردو کنونشن کے لئے ایک مثالی حیثیت رکھے گا۔

اسلامیہ کالج مہاراشٹرا کے بڑے بڑے ہال خالی نظر آ رہے تھے۔ اور ایک آسیبی سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ دھوپ نکل چکی تھی۔ اور سڑکوں پر چیختی چلاتی زندگی کا ہنگامہ تھا۔ سارے مندوب جا چکے تھے۔

چلتے ہوئے آخری بار میں نے کالج پر نظر ڈالی!

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا قیام یہاں تین دن نہیں رہا بلکہ میں

www.taemeernews.com

یہاں مہینوں اور برسوں سے ہوں۔ یہاں کے ایک ایک ذرہ سے مجھے محبت ہو گئی ہے اور اُسے چھوڑتے ہوئے میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری اپنی کوئی شے مجھ سے چھینی جا رہی ہے۔ یا پھر میں اپنی کسی عزیز شے کو چھوڑے جا رہا ہوں!

چلتے چلتے میں رک گیا۔ میں نے دیکھا ایک نوجوان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آ رہا ہے۔ شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ نوجوان نے قریب آکر کہا

جی میں بھی جا رہا ہوں ——— مجھے آپ کا پتہ چاہئے۔
شاید کسی کام کے لئے میں آپ کو زحمت دے سکوں ———

اچھا ——— اچھا ———

ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے سے گویا پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ہے کون؟ میں نے سوچا جسے میرے پتے کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ چہرہ بڑا جانا پہچانا ہے۔ میں نے اسے کہیں نہ کہیں دیکھا ہے اس کی آواز بھی میں سن چکا ہوں۔ مگر یاد نہیں آتا کہ کہاں اور کس جگہ۔

میرے اندر کے آدمی نے جیسے اسے پہچان لیا!

اور پھر میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اچھا تو آپ ہیں!

اس "آپ" میں سب کچھ تھا۔ جیسے میں اس نوجوان کو مطمئن کر رہا تھا کہ میں نے اُسے پہچان لیا۔

www.taemeernews.com

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ ایک لمحے کی کشمکش کے بعد مجھے میرے اندر کے آدمی نے یاد دلایا کہ یہ وہی نوجوان تھے جو میرے ہال کے آخری حصّے میں اپنے بستر پر کبھی لیٹا ہوا، کبھی بیٹھا ہوا اور کبھی کوئی کتاب پڑھتا ہوا نظر آتا تھا!

اور کبھی ہال سے باہر جاتے ہوئے۔ اندر آتے ہوئے، سیڑھیاں اترتے ہوئے یا چڑھتے ہوئے یا سامنے سے گذرتے ہوئے چپکے سے سلام کر لیتا تھا۔ لیکن میں نے اسے کبھی ہجوم میں نہیں دیکھا۔ اونچی اونچی آوازوں سے باتیں کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کسی اجلاس میں لوگوں سے بحث کرتے ہوئے یا سیر و تفریح میں قہقہے لگاتے ہوئے یا کھانے کی میز پر تیز تیز کھاتے ہوئے میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا۔ کہیں نہیں سنا۔ ہال کے باہر کی دنیا میں پتہ نہیں اس کی اپنی راہیں کونسی تھیں۔ راہ میں ایک بار بھی اُس سے مڈھبیڑ نہیں ہوئی!

اس سے زیادہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اور اس کے تعلق سے کچھ جاننے کی خواہش بھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ محض اس لئے کہ یہ نوجوان زندگی کی مختلف راہوں میں کبھی کبھی ملنے والی ان عجیب و غریب شخصیتوں میں سے ایک معلوم ہوتا تھا جو کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتیں۔ لیکن نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد اپنے پیچھے ایک بے چین یاد چھوڑ جاتی ہیں!

آج بھی مجھے اس کی یاد آ رہی ہے۔ پتہ نہیں اب وہ کیسا ہے!

وہ یوپی سے آیا تھا اور اس کا نام تھا محمد احمد خاں ادیب دُبلا پتلا

www.taemeernews.com

کمزور جیسے ابھی ابھی کسی ہاسپٹل کی بڈ سے ڈسچارج کیا گیا ہو، لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی زندگی تھی۔

میں نے کہا، احمد خاں صاحب، آپ تو بیمار نظر آتے ہیں۔ پھر ایسی حالت میں آپ نے اتنا لمبا سفر کیوں کیا؟ آپ کو تو آرام کرنا چاہیے۔

احمد خاں نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ اب وہ بیمار نہیں ٹھیک ہے ویسے اُسے اگر کوئی بیماری ہے بھی تو اس کا کوئی نام نہیں۔ اور اس کا واحد علاج یہی ہے کہ کوئی غذا نہ کھائی جائے۔ وہ دودھ یا میووں کے رس کے علاوہ کچھ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اور ڈاکٹروں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ سیال غذا استعمال کرے۔ اگر زندگی عزیز ہے۔ ورنہ ـــــ ورنہ !!

مگر یہ سب کچھ کیسے اور کیونکر ہوا!

میں حیرت سے نوجوان کو تکنے لگا۔ اور اسی ایک تمنائے میں، میں سب کچھ بھول گیا۔ اردو ـــــــ اور اردو کنونشن!

نہ جانے میں کسی بیمار کو دیکھ کر کیوں تڑپ اُٹھتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے بیماری کا وہ زہر خود میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔ سن ـــــ سن ـــــ سن!

پھر مجھے پتہ چلا کہ اس بیماری کا اُردو سے بڑا گہرا تعلق ہے!

تعلق کیا بلکہ یہ بیماری اردو تحریک ہی کی دین ہے۔ ہوا یوں کہ احمد خاں ادیب نے یوپی میں اُردو کے قانونی حق کو منوانے کے لئے مرن برت رکھا۔ چنانچہ اس مرن برت کے نویں دن یعنی ۲۹ جولائی کی رات کے بارہ بج کر تیس منٹ پر یو، پی پولس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق کہا جاتا ہے کہ گرفتاری کے وقت ان کی حالت تشویشناک

www.taemeernews.com

تھی۔ لیکن جیل میں بھی وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ اور مرن برت جاری رکھا۔ برت رکھنا ہماری جمہوری زندگی کا ایسا ہتھیار ہے جسے کوئی نہ کوئی وقت ضرورت استعمال کرتا ہے۔ لیکن احمد خاں ادیب کے برت کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے ایک قطرہ پانی کا یا لیموں کا اپنے حلق میں ڈالنا پسند کیا اور نہ انہوں نے کوئی طبی امداد قبول کی جو عام طور پر روا رکھی جاتی ہے۔ شاید اسی لیئے ایسے رہنما بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو دو مہینوں کے لمبے برت کے بعد بھی بڑے صحتمند رہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مزاج پرسی کرنے والا خود کو بیمار سمجھنے لگتا ہے۔ مگر اکیس دنوں میں احمد خاں ادیب کے معدے کا سارا نظام تہس نہس ہو کر رہ گیا۔ اور برت توڑنے کے بعد وہ اس قابل نہ رہے کہ کسی غذا کو ہضم کر سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ احمد خاں ادیب یوپی اور یوپی کے باہر بھی مجاہد اردو کے نام سے مشہور ہیں!

لیکن مجاہد کیوں؟ میں تو احمد خاں ادیب کو شہید کہوں گا جنہوں نے اپنی زندگی کی ہر شئے اردو پر قربان کر دی۔ حد یہ کہ اپنی زبان کا ذائقہ خون کی گرمی، جسم کی طاقت، جوانی کا حسن اور مستقبل کی ساری بہاریں اردو تحریک کو دے کر انہوں نے اس کے عوض خزاں کے چند زرد زرد پھول چن لیئے۔ اب احمد خاں ادیب کے یہاں باقی کیا رہا ہے؟

احمد خاں ادیب پہلے شہید ہیں۔ نہیں دوسرے شہید ہیں۔ نہیں تیسرے شہید ہیں۔ سچ پوچھیئے تو اردو کو اپنا خون دینے والا وہ عظیم انسان پہلا شہید ہے جس نے اردو کے مجاہد احمد خاں ادیب کے برت سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ۲۶ جولائی ۱۹۶۷ء کو چوبیس گھنٹوں

www.taemeernews.com

کے لئے بھوک ہڑتال کی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ہمیشہ کیلئے اپنی آنکھیں بند کرلیں!

اس عظیم اور بہادر انسان کا نام بھی بہادر تھا!

شری جے بہادر سنگھ کا شمار یوپی کمیونسٹ پارٹی کے مقبول لیڈروں میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ رکن پارلیمنٹ (اعظم گڈھ) بھی تھے۔ انہوں نے جب یہ محسوس کیا کہ اُردو پر ظلم ہو رہا ہے تو وہ خاموش تماشائی نہ رہ سکے۔ سیدھے اردو کیمپ پہنچے اور اس لسانی جبر کے خلاف بھوک ہڑتال شروع کردی۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ دل کے مریض ہیں۔ احباب اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر انہیں منع کر رہے ہیں کہ جے ــــ ٹھہر جاؤ ــــ ہم سب ٹھیک کردیں گے ــــــــ

لیکن جے بہادر سنگھ نے کسی کی بات نہ مانی۔ اخبار سیاست جدید کانپور اور حیدرآباد کے پندرہ روزہ اخبار ترقی اُردو (۱۵ اگست ۱۹۶۷ء) کی رپورٹنگ کے مطابق انہوں نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے بہت ہی واضح انداز میں کہا کہ "یوپی کی غیر کانگریسی حکومت نے ۲۳ نکاتی پروگرام میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی تجویز کو تسلیم کیا تھا۔ مگر اس حکومت نے دھوکہ دینا شروع کردیا۔ اردو کے لئے چند کلمات خیر کہنے اور محض رزولیشن پیش کردینے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا ــــ جب تک اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم نہیں کیا جاتا وہ کسی بھی لیڈر سے بات نہیں کریں گے"۔

چنانچہ جے بہادر سنگھ اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ اور انہوں نے کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا لیکن ان کے دل نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اور

www.taemeernews.com

اچانک قلب پر حملے کی وجہ سے وہ انتقال کر گئے۔

پنڈت نرائن پانڈے تیسرے شہید ہیں۔ اس بزرگ اردو کے عاشق کی عمر ستر سے اوپر تھی۔ لیکن ضعیفی کے باوجود ان کا حوصلہ جوان تھا۔ وہ فرقہ پرست قوتوں کے خلاف ایک مضبوط چٹان کی طرح جم گئے۔ اور ۹۶ گھنٹے کی بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ لیکن ۷۲ گھنٹوں کے بعد یعنی تین دن اور تین راتیں گذارتے ہی پنڈت جی کی حالت یکایک بگڑ گئی۔ انہیں فوری دواخانہ منتقل کیا گیا۔ لیکن دواخانہ کا کوئی ڈاکٹر اس عظیم روح کو روک نہ سکا۔ بچا نہ سکا۔ اور وہ سینکڑوں اردو دوستوں کو اپنے پیچھے روتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔

موت سے پہلے، اپنے آخری لمحوں میں جب وہ زندگی کے لئے ایک کاز کے لئے اور ایک بہتر مستقبل کے لئے سخت کشمکش کر رہے تھے۔ اپنے بیٹے کو آخری وصیت کی ــــ

انہوں نے کہا "میں اردو کی زیادہ خدمت نہ کر سکا تم اردو کے جھنڈے کو گرنے نہ دینا۔"

پنڈت جی کی یہ وصیت صرف ان کے اپنے لڑکے کی حد تک محدود نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو ہر اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والے کے لئے ہے۔ اور ڈاکٹر حسینی شاہد کے الفاظ میں:

"پنڈت جی کی یہ وصیت ہندوستان کی آتما کی آواز ہے
جو ان کے بیٹے ہی کے دل کو نہیں ہندوستان کی نئی نسل

www.taemeernews.com

کے دل کو گرماتی رہے گی۔ وہ نسل جس کو گاندھی جی اور اردو دونوں
کے قتل کا کفارہ ادا کرنا ہے۔"

انجمن ترقی اردو پندرہ روزہ
۱۶ ستمبر ۱۹۶۷ء

صرف پنڈت دیو نرائن پانڈے اور جے بہادر سنگھ کے نام نہیں، ابھی درجنوں اُردو کے دیوانوں اور عاشقوں کے نام گنانے ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے انداز میں اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا۔ کیا کوئی مقبرہ گوالٹولی کانپور کے ایک بزرگ حافظ محمد صدیق کو بھول سکتا ہے جنہوں نے اپنی عمر کی ایک سو دس بہاریں دیکھنے کے بعد (۲۴) گھنٹوں کے لئے علامتی ہڑتال کی!

اس طرح برت رکھنے والوں میں بائیں کمیونسٹ پارٹی جگدیش پور، ضلع سلطان پور کے برانچ سکریٹری رام سندر شکل، اردو محافظ دستہ کے رکن اشرف علی فگار، لکھنؤ کے عباس مرزا، قاضی یعقوب علی، شکیل احمد، مرزا مشتاق بیگ، حکیم محمد عباس منصوری، عبدالغفار، مرزا آفاق بیگ، کمال مصطفیٰ، ایوب حسین، عبدالسلام، نیاز احمد، عبدالقادر، محمد جمیل، ستیش کمار حیرت، خورشید افسر، اور ڈاکٹر صابر علی قابل ذکر ہیں۔ اور ان کی ہمدردی میں رشید قمر، فہمی انصاری، حیات وارثی، سعید اختر عزیز ربانی، راز الہ آبادی، تسنیم فاروقی، ارشد فاروقی، عبدالمتین اور نازش پرتاب گڈھی جیسے فنکاروں نے بھوک ہڑتال کی۔ کیا کوئی ان کے

www.taemeernews.com

اس جذبے سے انکار کر سکتا ہے جو آدمی کو مر مٹنے کی منزل تک لے جاتا ہے!
لیکن اردو زبان کی بقا کے لئے خود کو قربان کرنے والا چوتھا شہید
کون ہے؟
بھوج پوری شاعر چترنجن کی آواز آ رہی ہے۔ اُردو کی خاطر
شہید ہونے کے لئے ہمیشہ تیار رہوں گا ——— ہمیشہ ———

میں نے سوچا، یہ کیسی شہادت ہے جس کا چرچا نہیں ہوتا۔ گھر گھر
باتیں نہیں ہوتیں۔ اور نہ اردو کا کوئی انیس، کوئی دبیر جس پر مرثیہ لکھتا ہے!
احمد خاں ادیب تم زندہ شہید ہو۔ تم جہاں جہاں جاؤ گے اور
جس جس سے ملو گے۔ لوگ تم سے متاثر ہوں گے۔ تم نئی اور پرانی نسل کے
سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب ہو۔ اور تم، مائی ڈیر جے بہادر سنگھ آنریبل
ممبر آف پارلیمنٹ ایک مکمل انسان تھے جس نے اپنے ضمیر کی آواز سنی
ویسے زندگی میں تم سے ملاقات کا مجھے کبھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ لیکن
میں نے تمہارے بارے میں سوچا ہے۔ تمہارے جذبے کی حرارت کو محسوس
کیا ہے۔ اور تمہاری موت کی خبر جس دن اخباروں میں چھپی اسی دن میں
اور میری طرح سینکڑوں لوگوں نے عقیدت سے تمہارے سامنے اپنا
سر جھکایا۔ اور یہی عقیدت میرے محترم بزرگ پنڈت دیو نرائن پانڈے۔
آپ کے ساتھ بھی ہے۔ جے بہادر سنگھ اور آپ دونوں نے مل کر
فرقہ پرستوں کو جو جواب دیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں سنہری حروف
سے لکھا جائے گا۔ میرے محترم دوستو۔ آپ دونوں کا خون بے کار

www.taemeernews.com

نہیں جائیگا۔ اب شائد یہ کوئی کہہ نہیں سکے گا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

آپ دونوں سپاہی تھے!

اور سپاہی آخری سانس تک لڑتا ہوا اپنی جان دیدیتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ اسے دکٹوریہ کراس ملے گا یا مہا ویر چکر یا کوئی تمغہ جو اس کے نام پر اس کی بیوہ کو دیا جائے گا۔ میرے محترم بزرگ میں نہیں جانتا کہ آپ اور آپ کے ساتھی جیسے بہادر سنگھ کی بیوہ کو کیا انعام دیا جائے گا۔ اردو کی کونسی انجمن، کون سی اکیڈیمی اور علم و ادب کی کونسی محفل آپ دونوں کو کس خطاب سے نوازے گی۔ اور آپ کی یادگار میں کتنے میموریل ہال تعمیر کئے جائیں گے ——

چلتے چلتے میں رک گیا۔ اردو کا مجاہد، اردو کا شہید اور اردو کا جانباز سپاہی احمد خاں ادیب میرے سامنے مسکراتا کھڑا تھا ——

میں نے پھر ایک بار گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، بھئی کوئی تمہیں مانے یا نہ مانے۔ لیکن میں تمہیں مانتا ہوں کیونکہ تم ایک حوصلہ ہو۔ اُمید ہو۔ اور طلوع ہوتی ہوئی سحر کی ایک چمکتی کرن۔ اسلئے میں اپنی ساری عقیدت کے ساتھ تمہیں سلام کرتا ہوں۔

احمد خاں کی مسکراہٹ پر اوس پڑ گئی!

اور پھر اس نے میرا تفصیلی پتہ نوٹ کرتے ہوئے کہا، بہت بہت شکریہ ——

www.taemeernews.com

لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے وہ مسکراہٹ پھر چمکی۔ مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی۔ آپ نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ میں اس عقیدت کے قابل کہاں۔ میں تو اردو کے محافظ دستہ کا ایک معمولی خادم ہوں۔ اور اسی خدمت سے میری زندگی میں معنویت پیدا ہوئی ہے ورنہ جہاں تک اردو کو فائدہ پہنچانے کا تعلق ہے ابھی کچھ نہیں ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا کیس روزہ برت کچھ کام آیا۔ اور نہ میری زندگی۔ اس سے اچھا ہوتا کہ میں اسی برت میں ختم ہو جاتا۔ اس موت کی لذت ہی کچھ اور ہوتی۔ کم از کم مجھے سکون تو حاصل رہتا کہ میں اردو کے لئے مرا ہوں۔ مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی!

اسی لمحے ہاتھ اٹھا کر میں نے اردو کے سپاہی کو سلام کیا اور چلتے ہوئے آخری بار میں نے مہاراشٹرا کالج پر نگاہ ڈالی۔

خوش رہو اہل بمبئی
ہم تو سفر کرتے ہیں

ابھی ابھی میں بمبئی سے آیا۔ اور آتے ہوئے راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ میں خالی ہاتھ اپنے گھر جا رہا ہوں۔ حالانکہ لوگ جب ایک نئے شہر، مقام اور جگہ سے اپنے وطن لوٹتے ہیں تو وہاں کی چند چیزیں ضرور اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ تاکہ اپنے چہیتوں کو بطور تحفہ دے سکیں یہ ایک طریقہ بھی ہے۔ رسم بھی۔ اور محبت کا اظہار بھی۔ اور ان نظروں سے بچنے کا ایک بہانہ بھی جو ملتے ہی پوچھنے لگتی ہیں کہ تم ہمارے لئے

www.taemeernews.com

کیا کیا لائے ؟ گھر کے اندر اور باہر۔

آخر آدمی کس کس کی نظروں سے بچتا پھرے!۔

ایک ہارے ہوئے سپاہی اور بزدل انسان کی طرح میں نے گھر میں قدم رکھا۔ اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ یعنی میرے بچوں نے مجھے گھیر لیا!

ایک نے تالی بجا کر سوٹ کیس مجھ سے چھین لیا!

دوسرے نے سوٹ کیس کھول کر دیکھنا شروع کیا!!

تیسرے کو کچھ نہ سوجھا۔ اور اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا میرا گلاب جامن!

اور چوتھے نے میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ بابا میری ہیڈ مسٹریس کے نام اندرا گاندھی کا خط!!

میری بیوی دوڑی دوڑی آئی۔ اور اس اچانک حملے سے مجھے بچانے کے لئے اس نے ایک ایک کی خبر لی۔

بڑی آئی ہیڈ مسٹریس کی بچی ـــــ چل دور ہٹ ـــــ

اس نے کہا۔ اور ساتھ ہی اس نے ایک زوردار چپت لگائی۔

چپت کے ساتھ ہی بچوں کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ سب منہ لٹکائے ہوئے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور میرا چھوٹا لڑکا چیخ چیخ کر رونے لگا!

اپنی بیوی کیا، کسی کی بیوی، اور اس خطۂ زمین پر رہنے والی

www.taemeernews.com

کوئی عورت مجھے پسند نہیں آتی جب اس کا ہاتھ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر مارنے کے لئے اٹھ جاتا ہے۔ میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں، دنیا کی بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا سکتا ہوں۔ لیکن بچوں کو پٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ بچے میرے ہوں یا کسی اور کے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ لوں۔ اس عورت کا ہاتھ پکڑ لوں اور اسے روک دوں، اور پھر اس سے پوچھوں کہ تم کیسی ماں ہو جو بچوں کو مار رہی ہو۔ اگر ایسا ہی تھا تو تم نے ان معصوموں کو نو مہینے اپنی کوکھ میں رکھنے کی زحمت کیوں گوارا کی؟ بھئی تمہارا جواب نہیں۔ تم ماں ہو یا چڑیل ——— لعنت ہے تم پر!

اور پھر یہ بھی کوئی بات ہوئی، بچے نے کسی شے کی فرمائش کی اور تم نے دھڑا دھر پیٹ دیا ———

لیکن اس بار میں نے کچھ نہیں کہا۔ اپنی بیوی کے خلاف میرے دل میں نفرت کا کوئی جذبہ جاگا اور نہ میری لڑکی کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو مجھے پگھلا سکے۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری بیوی نے میری بچی کو یعنی اپنی بچی کو مناسب ہی سزا دی ہے۔ ہیڈ مسٹرس کی بچی دانے فقرے میں جیسے سب کچھ سمٹا۔ کہاں چار پانچ سو لڑکیوں کے اسکول کی ہیڈ مسٹرس اور کہاں پچاس کروڑ انسانوں کی وزیر اعظم، اور کہاں ایک کالج ٹیچر کی بچی ——— کیا وزیر اعظم کو اور کوئی کام نہیں جو ایک معمولی اسکول کی ہیڈ مسٹرس کو سفارشی خط لکھے ——— آہ ———

ایک کالج ٹیچر کی لڑکی کی اتنی جرأت کہ وہ وزیر اعظم سے سفارشی خط مانگے۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس جرم پر اسے سزا ملنی ہی

چباچکے تھے اور اسے ملی۔

میری لڑکی کی آنکھوں میں آنسو ہیں، زیدی صاحب کا لڑکا چپ چاپ بیٹھا ہے۔ کچھ نہیں جانتا، زینت کا بدن پیاسی میراث تک۔ رہا ہے جیسا لڑکی ٹانگیں پھیلائے ریت پہ چت پڑی ہے۔ پہاڑی عورت چیخ رہی ہے۔ اور سمندر کی لہروں کا شور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ لیکن یہ لہریں کیا کہتی ہیں!

لہریں کہہ رہی ہیں۔ لہریں کچھ نہیں کہہ رہی ہیں۔ اور لیوں بھی یہاں لہروں کی زبان کو کون سمجھتا ہے۔ میرے کانوں میں سیٹیاں بج رہی ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔ برہنہ عورتیں اور برہنہ مرد میرے اطراف ناچ رہے ہیں۔ میں ان میں گھرا ہوا خود کو بڑا اجنبی سا محسوس کر رہا ہوں اور ایک ایک سے پوچھ رہا ہوں کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔ میرے اندر کا آدمی بھی خاموش ہے۔ اسے بھی معلوم نہیں کہ میں آگیا ہوں۔ حالانکہ میں بمبئی کی چوپاٹی پر ہوں۔ نہیں میں بمبئی کی شیفر روڈ سے گذر رہا ہوں اور گھومتا ہوا ناندیڑ کی وزیرآباد روڈ پر آگیا ہوں اور اپنے دوستوں کو بتا رہا ہوں کہ میں ابھی ابھی بمبئی سے آیا۔ حالانکہ میں ناندیڑ گیا نہیں بلکہ بمبئی سے سیدھا اپنے وطن عزیز حیدرآباد لوٹ چکا ہوں۔ اور اب میں اپنے گھر میں ہوں۔ اپنے کمرے میں ہوں۔ اور کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا ان آوازوں کو سن رہا ہوں جو گلی سے آرہی ہیں۔ سڑک سے آرہی ہیں۔ برلا ہال سے آرہی ہیں۔ جیسے ابھی میں گھر پہنچا ہی نہیں بلکہ اب تک بمبئی میں ہوں۔ تین دن سے تین سال سے تیئیس سال سے۔ لیکن ابھی مجھے کتنے دن کتنے سال اور کتنی صدیاں برلا ہال میں بیٹھنا ہوگا؟

میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل رہا ہے۔

برلا ہال کی تمام روشنیاں بجھ چکی ہیں۔ شہ نشین کے نیلے آسمان پر بچھے چمک
چمکتے ہوئے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ اب کچھ بھی سوجھائی نہیں
دیتا۔ میرے پیروں میں، جسم میں اور دماغ میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں
اور قسم قسم کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ لیکن ان آوازوں
کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ مگر کسی کی آواز سمجھ میں نہیں
آ رہی ہے۔ اور یوں بھی ایک ساتھ اٹھنے والی آوازوں کا کوئی مفہوم نہیں
ہوتا۔ اور نہ شور کا کوئی کردار ہوتا ہے۔ میں چیخنا چاہتا ہوں لیکن چیخ نہیں
سکتا۔ میں کچھ بولنا چاہتا ہوں لیکن بول نہیں سکتا۔ میں شاید پیدائشی
گونگا ہوں جس کی کوئی زبان نہیں تھی یا جس کی ماں گونگی تھی۔
بہر حال مجھے کھلے دل کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہیے کہ میری
کوئی زبان نہیں تھی۔ اور اب میں صاف الفاظ میں اعلان کرتا ہوں کہ میری کوئی
زبان نہیں ہے۔ میں کسی بستی، گاؤں اور شہر میں پیدا نہیں ہوا بلکہ جنگل میں
پیدا ہوا۔ دراصل میں اس انسانی سماج کا وہ عجیب و غریب جانور ہوں
جو جنگلوں، پہاڑوں، غاروں اور پتھر کے دور کو پھلانگ کر سیدھا اس
مہذب دنیا میں آ گیا — قسم قسم کی آوازیں نکالتا ہوا۔ ہا ہا ہا
ہا ہا ——— میں جانور ہوں — جانور — ہا ہا ———۔

میرا دم گھٹ رہا ہے اور میری آنکھوں کے سامنے دور دور تک
اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے۔

www.taemeernews.com

آخری بات

اس رپورتاژ کو ابھی ابھی آپ نے پڑھا ہے۔ میں اس تعلق سے کچھ نہیں کہونگا البتہ اس "کے ڈی" کے بارے میں مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ یہ میں صرف میں نہیں ہوں بلکہ وہ کردار ہے جو اردو لکھتا پڑھتا ہے۔ بولتا ہے اور جس کے دل میں اردو کا درد ہے۔ اس کرب کا اظہار اس نے بار بار کیا ہے۔ اس طرح یہ کردار وسیع معنوں میں اردو عوام کا ایک نمائندہ کردار بن جاتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے آپ ہی بتائیے کہ کیا ہم اپنی زبان کے تعلق سے اتنے ہی سنجیدہ اور مخلص ہیں۔ جیسا کہ آپ نے پڑھا ؟

میرا خیال ہے کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان اگر کسی نے پہنچایا ہے تو وہ خود اردو بولنے والے عوام ہیں۔ وہ غیر مسلم ہوں یا مسلم اپنے بچوں کو اردو محض اس لئے نہیں پڑھاتے کہ یہ زبان روٹی روزگار کا مسئلہ حل نہیں کرتی۔ حالانکہ یہ صرف ایک خیال ہے۔ کیونکہ طالب علم اپنی مادری زبان کے ساتھ دوسری زبانیں بھی سیکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اردو بحیثیت "سکنڈ لنگویج" پڑھائی جائے تو بنیادی طور پر لڑکے یا لڑکی کے روزگار پر کچھ اثر نہیں پڑتا لیکن اس سہولت سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ نئی نسل کے اسی فیصد لڑکے اور لڑکیاں اردو سے واقف نہیں ہیں چنانچہ ملک کے انگلش میڈیم اسکولوں، پبلک اسکولوں اور کالجوں میں اردو بولنے والے عوام کے بچے دوسری زبانیں پڑھتے ہیں۔ ایسی صورت میں اردو تہذیب پر اگر دوسری زبانوں کا قبضہ ہو رہا ہے تو کونسی تعجب کی بات ہے۔ اسکے ذمہ دار اردو کے وہ نام نہاد رہنما بھی ہیں جو اردو کے نام پر ملک بھر میں چھوٹی بڑی دکانیں کھول کر بیٹھے ہیں۔ اور ہر سال حکومت سے لاکھوں روپیہ لے کر ہضم کر جاتے ہیں۔ لیکن بیچاری اردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اگر یہی صورت حال آئندہ بھی باقی رہتی ہے تو وہ دن دور نہیں جب اردو کو قبر میں اتار کر پہلی اور آخری کرسی رکھ کر فاتحہ پڑھنے والے خود اردو کے یہی رہنما ہوں گے۔

یہ صحیح ہے کہ دنیا کی کوئی قوت کسی زبان کو ختم نہیں کرسکتی لیکن کسی زبان کے

www.taemeernews.com

بولنے والے حالات سے مجبور ہوکر اپنی زبان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اصل کے قتل پر آمادہ ہو جائیں تو بھلا اسے کوئی بچا سکتا ہے ؟

آخری بات جو مجھے کہنی ہے وہ یہ کہ اب بھی وقت ہے کہ ہم اردو بولنے والے اپنی صفیں درست کرلیں۔ اور یہ عہد کریں کہ کسی طرح بھی ہو اپنی زبان کو باقی رکھیں گے اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں گے۔ عدد اسکول اور کالج کی سطح پر جہاں جہاں اردو کیلئے سہولتیں دی گئی ہیں اس سے استفادہ کریں گے اور اس کے بعد یقیناً ایک دن آئے گا جب اردو کو اس کا اپنا جائز قانونی حق ملے گا۔ اور دنیا کی کوئی سوشلسٹ مملکت اس حق سے انکار نہ کرسکے گی۔

آخر میں میں ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا ایک خوشگوار فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کے لئے میری ممکنہ مدد کی۔ ان میں جناب عابد علی خاں مینجنگ ٹرسٹی ادبی ٹرسٹ۔ جناب حسن الدین احمد، صدر دولا اکیڈیمی۔ جناب عزیز آصف صدر انجمن تعمیر ادب، جناب ڈی پی مترا لکچرر، جناب محمد شرف الدین لکچرر، جناب قدیر زماں، جناب یعقوب میراں، اور جناب رند سرشار قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ میں اپنے ان تمام پڑھنے والوں کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے پیشگی کتاب خرید کر میری قائم کی ہوئی روایت کو آگے بڑھایا۔

ملک کے ممتاز آرٹسٹ جناب سعادت علی خاں کا تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہا۔ دیکھئے اس بار انہوں نے اردو کے کرب کو رنگوں میں محفوظ کر دیا ہے۔

اس رپورتاژ کے خوشنویس جناب محمد غالب میرے ہی نہیں بلکہ آپ کے شکریے کے بھی مستحق ہیں جنہوں نے بڑی توجہ اور محنت سے اس کام کو انجام دیا۔

جناب میر اعظم علی، مالک نیشنل پرنٹنگ پریس کو میں قطعی نہیں بھلا سکتا۔ جنہوں نے اس رپورتاژ کو اپنے ادارے کی کتاب سمجھ کر اسے اس منزل تک پہنچایا۔

۳۰ر جون ۱۹۷۲ء

چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد دکن

عاتق شاہ

www.taemeernews.com

راوٗنڈیٹوریل کالج حیدرآباد کا وہ قدیم اور بہترین کالج ہے جس کے نام کا سکہ ہر طرف چل رہا ہے۔ قابل لکچرار اور پروفیسروں کی رہنمائی ان تمام طلبا کو حاصل ہے جو اس کالج میں پڑھتے ہیں۔ ذیل کی جماعتوں میں داخلے کیلئے عجلت کیجئے

- ایم بی۔ بی۔ ایس انٹرفس کلاس
- پی یو سی آرٹس۔ کورس

ایم پی سی۔ بی پی سی۔۔ صبح ۔ شام

سائنس کی جدید اعلیٰ لیباریٹری کی سہولتیں

- بی۔ اے
- بی کام ● بی۔ ایس۔ سی

(عثمانیہ اور وینکٹیشور یونیورسٹی)

- ایم۔ اے : ۱۔ انگریزی ادب

۲۔ معاشیات

خانگی امیدوار اس سہولت سے فائدہ اٹھائیں

نوٹ : عثمانیہ میٹرک کی تاریخ جغرافیہ جسے جناب ڈی۔ پی۔ متر الکچرر پبلک اڈوفشن نے لکھا ہے ہم سے طلب کیجئے۔ (اردو، انگریزی اور تلگو زبان میں)

پرنسپال

راوٗنڈیٹوریل کالج،

فون نمبر 51577) بنک اسٹریٹ، حیدرآباد ۱

www.taemeernews.com

ایمانداری اور بہترین مال کی سپلائی ہمارا نصب العین ہے

ذیل کی اشیاء ہم سے حاصل کیجئے

- الکٹریکل گڈس
- سفری سامان
- سوٹ کیس
- عطریات

میسرس ملا احسان علی حاجی بدرالدین

عثمانیہ بازار مچھلی کمان حیدرآباد دکن

تمام اقسام کے آئیل پینٹ، کلر، اینمل، وارنش، پالش اور سمنٹ کلر

کا واحد مرکز ——

گورنمنٹ سپلائیر

تشریف لائیے ——— ہم آپ کے منتظر ہیں

میسرس محمد عبدالجبار اینڈ سنس

آئیل پینٹ ہارڈویر مرچنٹ

ترپ بازار حیدرآباد دکن فون 41202

www.taemeernews.com

امجد پاشا فوٹو بیڑی کی مشہور بیڑیاں آج ملک میں شوق سے
پی جاتی ہیں

★ پاشا بیڑی
★ کارتوس بیڑی
★ گھوڑا بیڑی

REGISTERED TRADE MARK NO. 205170

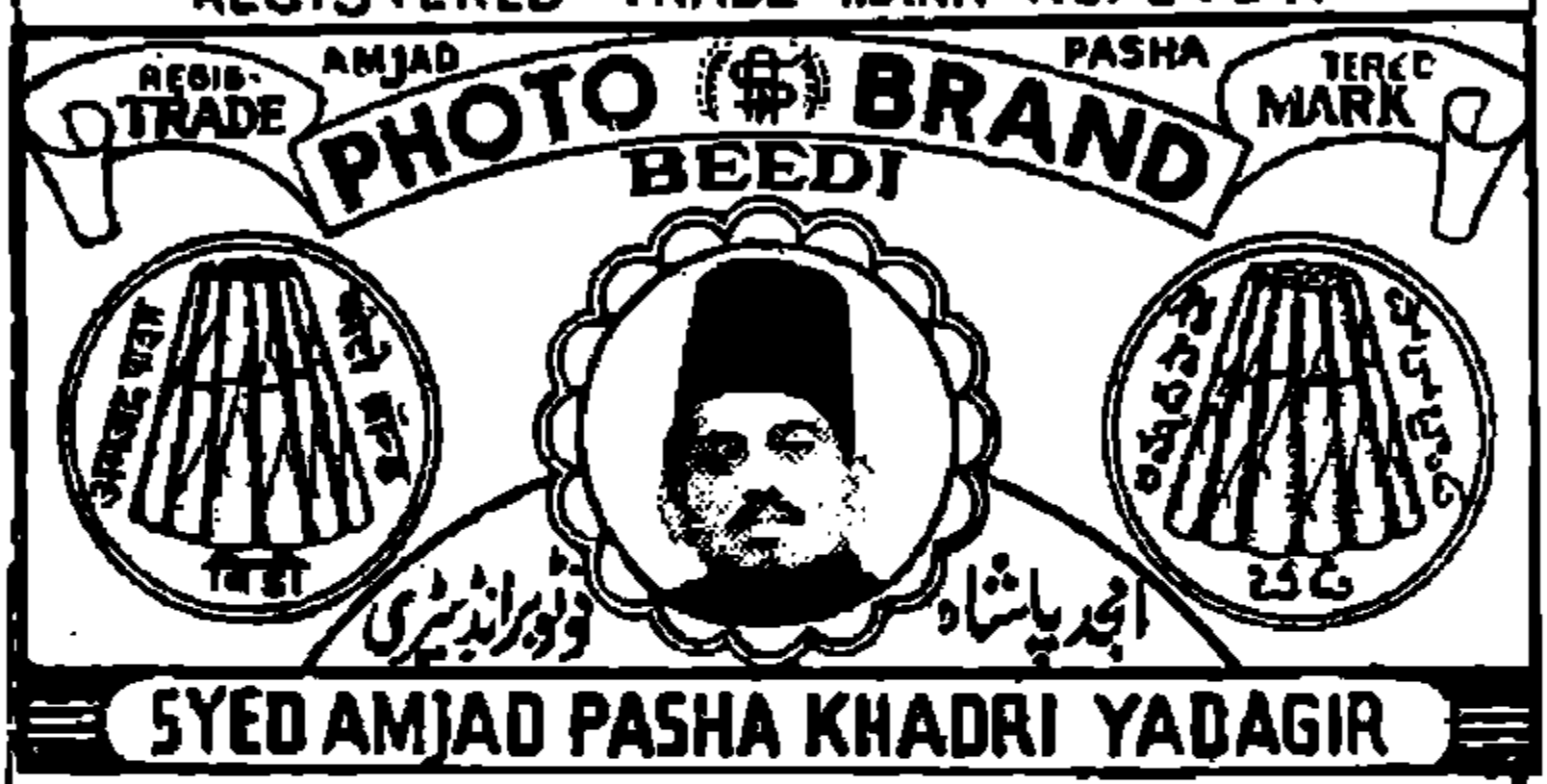

SYED AMJAD PASHA KHADRI YADAGIR

آپ بھی ان سے لطف اٹھائیے۔ ایک کش کے بعد پھر آپ کسی بیڑی کو
پسند نہیں کریں گے

ہم ہیں

امجد پاشا فوٹو بیڑی ورکس ورنگل

ٹیلیگرام ایڈریس "فوٹو بیڑی" فون 543

www.taemeernews.com

صرف اچھا ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ اچھا کیمسٹ بھی ضروری ہے ۔ اسلئے
ہمارے یہاں سے ملک کی رجسٹرڈ کمپنیوں کی بنی ہوئی دوائیں خریدئیے
یاد رکھئے ۔ ملاوٹی دوائیں مریض کو نقصان پہنچاتی ہیں ۔ ہمارا بنیادی
آدرش یہی ہے کہ مریض جلد شفایاب ہو ۔
دن اور رات کے کسی لمحے بھی تشریف لائیے ۔ آپ
ہر وقت ہمیں مستعد دیکھیں گے ۔

میسرس پرنس میڈیکل ہال

سلطان بازار ۔ حیدرآباد دکن فون 41977

کروڑوں کی پسند

لاسا اسپیشل چائے

لسا چاکلیٹ چائے

• ہر گھر میں • ہر تقریب میں • ہر سوسائٹی میں
• ہر پارٹی میں استعمال کی جارہی ہے ۔ اپنے
محلے کی ہر چھوٹی بڑی دکان سے طلب فرمائیے
نیلگری ٹی امپوریم سیلز ڈپو معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس : 43421 گرام : لسا
" " فیکٹری : 53340

www.taemeernews.com

سونا پروڈکٹس کا خوشبودار اور منہ کو صاف کرنے والا چیونگ گم اور
ببل گم کھائیے جو مزے میں عمدہ ہے اور جسے کھا کر آپ کی طبیعت سیر نہیں
ہوگی۔ بالکل اسی طرح ــــ شانتی پروڈکٹس کی

- چارمینار برانڈ سیویاں اور
- گولڈ فنگر، ایک ایسی غذا ہے جو وٹامنس سے پر ہے آرڈر پر

فوری سپلائی کی جاتی ہے۔ اضلاع کے ایجنٹ ہم سے ربط پیدا کریں

سونا پروڈکٹس

چادر گھاٹ حیدرآباد ۲۴

ٹیلیگرام "گم کنگ" فون نمبر 53255 پوسٹ بکس (۱۸) حیدرآباد

آپ جانتے ہیں!

"قطب شاہی عصرانہ"

کی شہر میں دھوم ہے۔ ایک بار تشریف
لائیے اور ہمیں خدمت کا موقع دیجئے

میسرس مکہ ہوٹل

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

اجلے کپڑے ہمیشہ شخصیت کو نکھارتے
ہیں۔ یاد رکھئے • واشنگ سوپ
• سدھا کر سوپ
• پیلی سوپ
ہمارے بیان کی تصدیق کرے گا۔

میسرس
مہاویر سوپ فیاکٹری

فیل خانہ۔ حیدرآباد
فون 42732

www.taemeernews.com

کالجوں کے لئے

● علم نباتات (باٹنی)

● علم حیوانات (زوالوجی)

پر مختصر اور منفرد چارٹس (نقشہ جات)

بایو وژول چارٹس ہیں۔

تیار کردہ

بایو وژول پروڈکٹس

1-5-7/1 مشیرآباد۔ حیدرآباد ۲۰

فون نمبر 73621

اعلیٰ قسم کا کھوپرے

کا تیل

ہم سے طلب فرمایئے

مسرس حبیب اینڈ کمپنی

ہول سیل کرانہ مرچنٹ

بیگم بازار حیدرآباد دکن

کسی بھی تقریب کے لئے ہماری خدمات

حاصل کیجئے یہاں جنرل گڈس سے لیکر

جملہ سامان تقریب، کرسیاں، شامیانے

پکوان اور کھانے کے ہمہ اقسام کے برتن

آرڈر کے ساتھ ہی سپلائی کئے جائیں گے

مسرس

یثرب جنرل اسٹور

ھنمکنڈہ

ٹیلیفون 7434

اصلی کھوپرے کے تیل کے

تھوک بیوپاری

مسرس اکبر اینڈ کمپنی

ہول سیل

کرانہ اینڈ کمیشن ایجنٹ

بیگم بازار، حیدرآباد

فون نمبر آفس 4567 فون نمبر گھر 42288

www.taemeernews.com

عید شادی اور روزمرہ کی ضروریات کیلئے
ہماری بیکری تشریف لائیے۔ ہماری خصوصیات:
● ڈنر رول ● شیرمال ● اسپیشل ٹوسٹ
● فروٹ ٹوسٹ ● عثمانیہ بسکٹ ● نمکین
بسکٹ ● برتھ ڈے کیک ● پلم کیک ● کریم کیک

روز کمپنی بیکرس اینڈ کنفکشنرس
آف فروٹ

چادر گھاٹ حیدرآباد ۲۴
فون 42622

ہمارے یہاں
ہر اقسام کی ڈائریاں اور عمدہ کاغذ
سے لے کر لکھنے پڑھنے کی ہر چیز مل جائیگی
صرف آپ کے حکم کا انتظار ہے۔ اس
کے علاوہ شادی کے رقعے ہمارے بزنس
کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ہمیں یاد
رکھئے۔

پی وینکٹ سوامی اینڈ سنس

ہول سیل اسٹیشنری مرچنٹ
عابد روڈ حیدرآباد

اسے مبالغہ نہ سمجھئے۔ سائیکلوں کی دنیا
میں صرف ہمارے ہی نام کا سکہ چلتا ہے
سائیکلوں کے مختلف پارٹس بھی آپ ہم
سے طلب کر سکتے ہیں۔

مسرس کلیان ٹریڈرس،
ڈیلرس ان سائیکل

اسٹیشن روڈ ورنگل
آندھرا پردیش

ایک بار زحمت کیجئے
آپ ہماری ایمانداری اور اعلیٰ مال
سے مطمئن ہو جائیں گے۔

شیخ داود محمد عمر

ہول سیل جنرل مرچنٹ
بیگم بازار حیدرآباد ۱۲
فون نمبر 45648

www.taemeernews.com

مکانات کی تعمیر کے لئے قرضہ حاصل
کرنے کے لئے ہماری سوسائٹی کے
رکن بنئے اور ہماری خدمات حاصل
کیجئے

ملے پلی کوآپریٹیو
ہاؤزنگ سوسائٹی
قدیم ملک پیٹھ
فون 41679

تعمیر امکنہ کے لئے قرضہ جات حاصل کیجئے
آپ کی آمدنی -/400 Rs ماہانہ سے
کم ہو تو آپ "لو انکم گروپ اسکیم" کے ممبر
بن سکتے ہیں۔ اگر زائد ہو تو مڈل انکم
گروپ اسکیم سے قرضہ بالترتیب
Rs 12,500/- اور -/25,000 ملیگا۔
ذاتی پلاٹ پر مکان کی تعمیر کے لئے ہماری
سوسائٹی کی خدمات حاصل کیجئے۔ ورنہ
ہماری سوسائٹی آپ کو پلاٹ بھی دلا
سکتی ہے

معتمد
رام کرشنا نگر کوآپریٹیو ہاؤزنگ سوسائٹی
سوپر بازار روڈ متصل فتح نگر ، حیدرآباد
فون 41369

درِ نجف
طب قدیم کا ایک نادر شاہکار۔ نگاہ
کا کام کرنے والوں کے لئے بہترین دوا ہے
روہے ، سرخی ، دھند ، جالا ، پھولا ، سفید
موتیا ، آنکھوں کے آگے ترمرے آنا ،
آنکھوں سے پانی بہنا ، غرض اندھے پن کے سوا
آنکھوں کے جملہ امراض میں مفید بغیر کسی مرض
کے بھی اسے استعمال کرتے رہئے۔ نگاہ
نہ گرے گی۔
تیار کردہ
دارالفیض رحمانی
درِ نجف بلڈنگ دیوبند

عمدہ کاغذ اور تمام اقسام کی چھپائی
اور بائنڈنگ کے لئے ہمارے یہاں
تشریف لائیے —
- سائنٹیفک اور ایجوکیشنل ایکوپمنٹ
- ہینڈ ڈپلیکیٹنگ مشین
- درنصابی کتابیں ہم سے خریدیئے۔

میسرس وجے اسٹیشنرس
بک سیلرز
مقابل پولس اسٹیشن ہنمکنڈہ ضلع ورنگل

www.taemeernews.com

ممتاز افسانہ نگار
عاتق شاہ
کی کامیابی اور ان کی نئی تصنیف
خالی ہاتھ کے ساتھ میری
نیک تمنائیں ـــــ

صائب رزاقی

عاتق شاہ جس کے ہاتھ
خالی ہوں گے لیکن جس کا ذہن صرف
اُردو کی خدمت کے جذبہ سے بھرا ہے
اور جو دائم ہے

نیک تمناؤں کے ساتھ
موتی میٹرنٹی و نرسنگ ہوم
نبولی اڈہ حیدرآباد
فون 45757

عمدہ کوالٹی اور خوش ذائقہ بیڑی تیار کرنے والے مشہور کارخانے جو اس
صنعت کے اہم ستون ہیں

- منشی بھائی بیڑی ورکس حیدرآباد
- بکجران بیڑی ورکس آرمور، نظام آباد
- چار بھائی بیڑی ورکس نظام آباد

اور جن کی بیڑیوں کو عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی شوق سے استعمال کرتے ہیں
مصنف کے ساتھ نیک تمنائیں ـــــ
سید حبیب فضل اینڈ عباس حسین
مستاجران برگ آبنوس کریم نگر

www.taemeernews.com

عاتق شاہ

خالی ہاتھ

رپورتاژ

www.taemeernews.com

عاتق شاہ

عاتق شاہ کی پہلی کہانی "گرگٹ" ہے جو حیدرآباد کے اخبار "میزان" میں ۲۱ رمئی ۱۹۴۵ء کو شائع ہوئی اور پہلا مجموعہ "فٹ پاتھ کی شہزادی" مئی ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آیا۔ ۱۹۵۳ء میں حکومت حیدرآباد کے منعقدہ اردو مختصر افسانے کے ایک مقابلے میں جس میں ایک سو اکتیس افسانہ نگاروں نے حصہ لیا تھا، شاہ نے اپنے افسانے "مائی ڈیر شکنتلا" پر پہلا انعام حاصل کیا۔ اب تک ان کے چھ مجموعے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ شاہ لکھتے نہیں بلکہ زمانے اور زندگی کی تلخ حقیقتیں ان سے لکھواتی ہیں اپنے منفرد اسٹائل کی وجہ سے یہ فوراً پہچانے جاتے ہیں۔

۷ رنومبر ۱۹۳۳ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد غم روزگار کے چکر میں پھنس گئے۔ آخر دس سال کی جد و جہد کے بعد انہوں نے پھر تعلیم کی طرف توجہ دی چنانچہ مارچ ۱۹۶۳ء میں ایوننگ کالج حیدرآباد سے درجۂ دوم میں بی۔ اے کیا۔ اور مارچ ۱۹۶۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے درجۂ اول میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اردو کے لیکچرر ہیں۔